خورشید رضوی کی غزل میں عصری حسیت

(تحقیقی وتنقیدی جائزہ)

تحقیقی مقالہ برائے ایم ایس اُردو

مقالہ نگار:

سید آغا خاور عباس

رجسٹریشن:140-FLL/MSURDU/F14

نگران:

ڈاکٹر کامران عباس کاظمی

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبۂ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

۲۰۱۸ء

اقرار نامہ

میں،سید آغا خاور عباس حلفاً بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی ،اسلام آباد کے ایم ایس(اُردو) سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر کامران عباس کاظمی کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گا اور میرا یہ مقالہ سرقہ سے پاک ہے۔

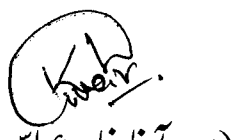

(سید آغا خاور عباس)

مقالہ نگار

شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

۲۰۱۸ء

ACC # IH-21155

MS

ع س غ

ادبیات . شاعری . تنقید و تشریح

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

درج ذیل مقالہ شعبۂ اُردو، کلیہ زبان وادب، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں ایم ایس اُردو کی ڈگری کی جزوی منظوری کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ زیرِ دستخطی نے یہ مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے اور MS اُردو کی ڈگری تفویض کرنے کی منظوری دیتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **خورشید رضوی کی غزل میں عصری حسیت (تحقیقی وتنقیدی جائزہ)**

مقالہ نگار: سیّد آغا خاور عباس

رجسٹریشن نمبر: 140-FLL/MSURDU/F14

کمیٹی دفاع مقالہ

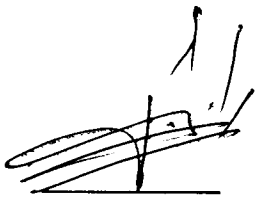

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن
چیئرمین
شعبۂ اُردو

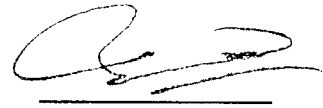

پروفیسر ڈاکٹر منور اقبال احمد
ڈین
کلیہ زبان وادب

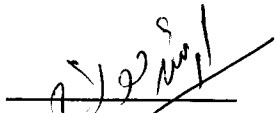

ڈاکٹر ارشد محمود آصف
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
اندرونی ممتحن

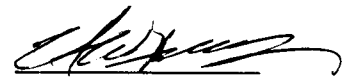

ڈاکٹر عابد حسین سیال
ایسوسی ایٹ پروفیسر (اُردو)
نمل، اسلام آباد
بیرونی ممتحن

ڈاکٹر کامران عباس کاظمی
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
نگران مقالہ

جولائی، 2018ء

فہرست ابواب

نام ابواب	صفحہ نمبر
پیش لفظ	۱
باب اول: عصری حسیت: عمومی مباحث	۵
باب دوم: خورشید رضوی کی غزل میں سیاسی وسماجی شعور	۷۹
باب سوم: خورشید رضوی کی شاعری میں تاریخی وتہذیبی شعور	۱۱۴
باب چہارم: خورشید رضوی کی غزل کا موضوعاتی مطالعہ	۱۵۹
باب پنجم مجموعی جائزہ	۱۸۳
کتابیات	۱۸۸

کرلیا۔لیکن یہ تبدیلی یک جنبش ابرونہیں آئی بلکہ ایک خاص وقت کے بعد اسے قبول کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر سید خورشید الحسن رضوی کا شمار بھی جدید اُردو شاعری کے اُن نمائندہ شعرا میں ہوتا ہے، جنہوں نے اپنی اُردو غزل میں معاشرے کو موضوع بنایا اور اس میں موجود مسائل کی عکاسی کی۔خورشید رضوی ایک عظیم محقق ایک شفیق اُستاد اور اعلیٰ پائے کے غزل گو شاعر ہیں۔ان کے ہاں راویت سے وابستگی اور جدید موضوعات کا تنوع موجود ہے۔خورشید رضوی کی غزل اپنے عصری شعور کی بنا پر اپنے معاصرین میں منفرد اور نمایاں مقام رکھتی ہے۔ اسی بات کو بنیاد بناتے ہوئے راقم الحروف نے اپنے تحقیقی مقالہ کا موضوع ''خورشید رضوی کی غزل میں عصری حسیت (تحقیقی وتنقیدی جائزہ)'' منتخب کیا ہے۔جس میں ان کی غزل کو عصری تناظر میں پرکھا گیا ہے۔

مقالہ ہذا کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

باب اول	عصری حسیت: عمومی مباحث
باب دوم	خورشید رضوی کی غزل میں سیاسی وسماجی شعور
باب سوم	خورشید رضوی کی غزل میں تاریخی وتہذیبی شعور
باب چہارم	خورشید رضوی کی غزل کا موضوعاتی مطالعہ
باب پنجم	مجموعی جائزہ

باب اول میں عصری حسیت کا مفہوم پر بحث کی گئی ہے۔اس کے بعد 'سیاسی وسماجی شعور' کو درک کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس کے بعد 'تاریخی وتہذیبی شعور' کو بیان کیا گیا ہے۔پھر 'روح عصر' کو بیان کیا گیا ہے۔ اور آخر میں 'اردو غزل اور عصری حسیت: ایک محاکمہ' کے عنوان سے مجموعی طور پر اُردو غزل کے تاریخی منظر نامے کو اپنا موضوع بحث بنا کر عصری حسیت کے پہلو کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ باب دوم میں خورشید رضوی کی غزل میں سیاسی شعور اور خورشید رضوی کی غزل میں سماجی شعور کا جائزہ لیا گیا ہے۔جس کی مدد سے قاری خورشید رضوی کی تجرباتی ومشاہداتی حسیات کا بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے۔ باب سوم میں خورشید رضوی کی غزل میں تاریخی شعور پر بحث کرتے ہوئے ان کی غزل کو تہذیبی شعور کے تناظر میں دیکھا گیا ہے اور خورشید رضوی کا اپنی تاریخ وتہذیب سے انسلاک ان کی غزلوں میں پائے جانے والے تاریخی وتہذیبی شعور کے حوالے سے واضح کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ باب چہارم میں خورشید رضوی کی غزل کا موضوعاتی مطالعہ شامل ہے۔جس میں ان کی غزلیات میں آنے والے اہم موضوعات کو بیان کیا گیا ہے۔جس سے ان کے مشاہدات کی وسعت کا اندازہ با آسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

باب پنجم میں مقالہ کا مجموعی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ جس میں خورشید رضوی کی ادبی خدمات کے ساتھ ان کے ادبی مقام و مرتبے کا تعین بھی کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ نیز ان کی غزل میں عصری حسیت کو مفروضہ بنا کر بعد از تحقیق جو نتائج سامنے آئے ہیں ان کو قلمبند کیا گیا ہے۔

مقالے کی تکمیل کا انحصار بروقت مواد کی فراہمی پر ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں راقم الحروف کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس سلسلے میں مختلف لائبریریوں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ سب سے زیادہ موادو معاونت اورینٹل کالج لاہور کی لائبریری و عملے کی جانب سے حاصل ہوئی۔ اس کے بعد میرے نگران ڈاکٹر سید کامران عباس کاظمی نے متعلقہ مواد کی نہ صرف نشاندہی کی بلکہ فوراً اسے عنایت بھی فرمایا۔

اورینٹل کالج لاہور کے سفر کا بیان ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے ذکر کے بغیر نامکمل رہے گا۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ مجھے خورشید رضوی سے ٹیلیفونک رابطے کے ذریعے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر زاہد منیر عامر پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام خورشید رضوی کے حوالے سے ایک مفصل کتاب 'ارمغانِ خورشید' کے نام سے شائع کر چکے ہیں۔ لیکن مختلف دکانوں سے پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ مارکیٹ میں دستیاب نہیں ہے اور یہ کتاب ڈاکٹر زاہد منیر عامر سے ہی مل سکے گی۔ لہذا اس کتاب کی تلاش میں اسلام آباد سے اورینٹیل کالج لاہور میں ڈاکٹر زاہد منیر عامر کے آفس کا رخ کیا گیا تو وہ دو دن تک کچھ نجی مصروفیات کی بنا پر رخصت پر تھے۔ اب کتاب کے بغیر وہاں سے واپسی ناممکن تھی۔ لہذا تیسرے دن ایک امید کے سہارے دوبارہ اورینٹل کالج کا رخ کیا تو وہاں معلوم ہوا کہ ڈاکٹر زاہد منیر عامر کی عدم موجودگی میں کتاب 'ارمغانِ خورشید' کا ملنا تو درکنار اُس کو دکھانے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ ایسی مشکل صورتِ حال کے بعد راقم الحروف نے جب واپسی کا ارادہ کیا تو نظر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا پر پڑی جو اپنے آفس میں داخل ہو رہے تھے۔ کچھ لمحے توقف کیا اور ان سے کتاب کے متعلق گزارش کرنے یا نہ کرنے پر سوچ بچار کرنے لگا۔ مگر جب واپس اسلام آباد کے سفر پر غور کیا تو ان سے ملنے کا ارادہ کیا اور سارا ماجرا ان کے گوش گزار کرنے کی ٹھانی۔ میں خواجہ صاحب کے دفتر میں داخل ہوتے ہوئے ہچکچاہٹ کا شکار تھا بہر حال ان کے مشفقانہ انداز سے مجھے اعتماد حاصل ہوا اور میں نے مکمل ماجرا کہہ ڈالا اور اگلے لمحے میری مایوسی خوشی میں تبدیل ہوئی جب انہوں نے کتاب کی فراہمی کا یقین دلاتے ہوئے مجھے اپنے ساتھ آنے کا کہا اور کلرک آفس میں موجود ہیڈ کلرک کی سرزنش کرتے ہوئے کتاب مجھے مرحمت فرمائی۔

بعد ازاں ادارہ فروغ قومی زبان اسلام آباد، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز (نمل) اسلام آباد کی لائبریریوں سے بھی استفادہ

کیا یوں اپنے تحقیقی مقالے کو مکمل کرنے میں کامیاب ہوا۔

مقالہ ہذا کی تکمیل مقامِ شکر ہے۔ سب سے پہلے شکر اس ذات کا جس نے فکر و تدبر کی دولت سے مالا مال کیا اور جو شکر و تعظیم کے لائق ہے۔ اس کے بعد میں اپنے والدین و خواہران کا تہہ دل سے ممنون ہوں جن کی ہر لحہ حوصلہ افزائی نے مجھے ایک نئی توانائی بخشی۔ میں اپنے نگران ڈاکٹر سید کامران عباس کاظمی کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے اپنی مصروفیات و زمینی فاصلے کو کبھی عُذر کے طور پر استعمال نہیں کیا بلکہ وہ ہمہ وقت خندہ پیشانی سے پیش آئے اور اپنے مفید و موثر مشوروں سے نوازا۔ دیگر اساتذہ میں ڈاکٹر طیب منیر (مرحوم)، ڈاکٹر عزیز ابن الحسن، ڈاکٹر ارشد محمود آصف (ارشد معراج)، ڈاکٹر روش ندیم کا بھی شکریہ ادا کرنا لازمی ہے۔ کیونکہ اس کاروانِ راہبراں کے بغیر منزل تک رسائی ناممکن تھی۔ اساتذہ کے بعد دوست احباب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کے ساتھ گزرنے والا ہر لحہ یادگار بھی ہے اور نا قابلِ فراموش بھی۔ ان میں عادل بادشاہ، عتیق احمد، ملک مدثر حسن اعوان، الطاف سروش، محمد علی مہدی، اُلفت عباس، ساجد اقبال و دیگر احباب شامل ہیں۔ دعا ہے کہ مالک انہیں تا دیر سلامت رکھے اور اپنی رحمتوں سے نوازے۔

آخر میں یہ بات واضح کرتا چلوں کہ جہاں تک ممکن ہو سکا راقم الحروف نے اپنے تحقیقی کام کو بہتر سے بہتر طور پر مکمل کرنے کی سعی کی ہے۔ بہر حال میرے اس پہلے تحقیقی کام کے معیاری ہونے کا فیصلہ اہلیانِ فکر و دانش پر ہی منتج ہے۔ ویسے کہا جاتا ہے کہ الانسان مرکب خطا والنسیان (انسان خطا و غلطیوں کا مرکب ہے)۔ لہذا یقیناً اس مقالے میں بھی کچھ اغلاط موجود ہوں گی۔ جو کمی رہ گئی وہ انشاء اللہ آئندہ پوری کی جائے گی۔

آغا سید خاور عباس نقوی

ایم ایس اُردو

باب اوّل: عصری حسیّت عمومی مباحث

الف۔ عصری حسیّت سے کیا مُراد ہے؟

ب۔ سیاسی وسماجی شعور

ج۔ تاریخی وتہذیبی شعور

د۔ روحِ عصر

ھ۔ اُردو غزل اور عصری حسیّت: ایک محاکمہ

عصری حسیت، عمومی مباحث

(الف) عصری حسیت؛ تفہیم وتوضیح:

عصری حسیت ادبی اصطلاح ہے۔ عصری حسیت کو بطور ادبی اصطلاح کے سمجھنے سے قبل ہمیں 'عصر' کو درک کرنا پڑے گا اور اس کے ساتھ انسانی تاریخ کے دریچوں میں جھانکنے کے ساتھ ارتقائے زمانی و ذہنی کو سمجھنا پڑے گا۔ کیوں کہ جب سے انسان نے منازلِ شعور کو طے کرنا شروع کیا ہے، اور اپنے گرد و پیش پر غور وخوض شروع کیا ہے، تب سے انسان گتھیوں کو سلجھانے میں مصروفِ عمل ہے۔ انسان کی زبان سے 'کیوں'، 'کیا'، 'کیسے'، جیسے کلمات کا ظہور شعور کے سفر کی طرف نشاندہی کرتا ہے۔ انسان نے جہانِ نو میں قدم رکھتے ہی اپنی فکری صلاحیتوں کا لوہا منوانے کے لیے ماحول میں موجود وسائل سے استفادہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ بات علماء بشریات اور تاریخ کے ماہرین کے نزدیک شروع سے ہی بحث کا موضوع بنی ہوئی ہے کہ انسانی تاریخ کی ابتدا کہاں سے ہوئی۔ اس کائنات میں موجود ہر مخلوق 'جبلّت' کے تابع ہے۔ انسانی ارتقا کی تاریخ ہمیں یہ بات بتاتی ہے کہ مخلوقات میں انسان نے ہی اپنی جبلتوں کو زیر کیا ہے اور ان پر تصرف حاصل کیا ہے۔ جبلّت پر تصرف کی بنیاد پر ہی انسان نے قوانینِ فطرت کو اپنے انداز سے پرکھنے اور اپنے ماحول کے مطابق ڈھالنے کا آغاز کیا۔

سب سے پہلے جن معروضات کی طرف انسانی جبلتوں نے اشارہ کیا وہ 'مکان' اور 'زمان' ہیں۔ انسان نے جب اپنے اردگرد پھیلے مناظر پر غور کیا اور اُن مناظر سے اپنے لیے سامانِ زیست کا اہتمام کیا تو شاید یہی انسانی شعور کی اولین انگڑائی تھی۔ قوانین فطرت سے ہم آہنگ ہونے کے بعد پہلے پہل جس مخفی قوت نے انسان کے اندر جنم لیا وہ 'اعتماد' کی طاقت تھی۔ اسی قوت مخفیہ کی بنیاد پر ہی انسان نے غار سے نکلنے کا فیصلہ کیا، تو اسے قوانین فطرت سے مزید ہم آہنگی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جس کی بنیاد پر انسان نے آگ ایجاد کی۔ نہ انسان کا سفر رکا اور نہ ایجادات کا سلسلہ رکا۔ لباس، ہتھیار، وسائل سفر، وغیرہ یہ سب کچھ انسان کے ذہنی ارتقا کی داستان ہے۔ جو آج کل کے سائنسی دور میں رہنے والے انسان کو بالکل افسانہ معلوم ہوتی ہے۔ ارتقا کا یہ عمل خارجی ماحول تک محدود نظر نہیں آتا۔ بلکہ داخلی طور پر بھی انسان میں عجیب وغریب تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ مزید واضح کیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان صرف جسمانی طور پر بلوغت کے عمل سے نہیں گزرتا۔ بلکہ ذہنی طور پر بھی بلوغت کا عمل ہوتا ہے۔ جو اس کے تخیل سے عمل تک اثر انداز ہوتا ہے۔

انسانی ارتقا کی یہ تاریخ اقوام، مذاہب، تہذیبوں کے عروج و زوال سے مربوط ہے۔ کیوں کہ تاریخ ایک ایسا عمل ہے جس میں ماحول اور اس میں بسنے والے انسانوں اور ان سے مربوط چیزوں کے اُتار چڑھاؤ نمایاں انداز میں سامنے آتے ہیں۔ ذہنی بلوغت کا یہ سفر چند سالوں پر محیط نہیں ہے۔ بلکہ اس سفر کا عرصہ 'حیرت سے حقیقت' تک کا عرصہ ہے۔ انسان زمانہ قدیم سے ہی جن گتھیوں کو سلجھانے میں مصروف ہے وہ 'کائنات کی تفہیم' اور 'زمانہ' یا ماہیت 'عصر' ہے۔ فی زمانہ جس نے جو سمجھا 'کائنات کی تخلیق' اور 'عصر' کے متعلق حرفِ آخر سمجھ کر صادر فرما دیا۔ ہر دور میں ہر صاحبِ ذی شعور نے اپنے اپنے پیروکاروں کو سمجھانے کی خاطر مختلف انداز میں 'عصر' کے متعلق بیان کیا، قدیم مذاہب کے ماننے والوں نے اپنے راہبروں سے ان گتھیوں کو سلجھانے کے متعلق سوالات بھی کیے اور انہیں جوابات بھی دیے گئے مگر وہ جوابات یقیناً اُس زمانے کے لیے تو تسلی بخش ہوں گے، لیکن ہر زمانے کے محرکات و مندرجات علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں لہذا جیسے جیسے ارتقائی عمل پروان چڑھتا گیا اور جبلت نے مزید پوچھنے، سوچنے، پر مجبور کیا تو مزید گہرائی سے سوالات و جوابات کا جائزہ لیا گیا اور فکری گہرائی سے اصل حقیقت کو منصۂ شہود پر لانے کا عمل جاری رہا۔

معلوم حقائق کے مطابق دنیا کی قدیم تصنیف 'رگ وید' میں بھی انسانی شعوری کاوشوں کا ذکر ہے، جس میں انسان کائناتی اسرار کو سمجھنے کی جستجو میں مگن ہے۔ رگ وید میں 'کال' یعنی 'زمان' کو اہمیت دی گئی ہے اور زمان کو ہی مسلسل رواں، دواں متحرک زندگی کا محرکِ اول قرار دیا گیا ہے۔ گویا 'کال' کے ذریعے ہی انسان محسوسات کے عمل سے گزرتا ہے اور تقریباً اعمال کو سرانجام دینے کا محرک 'کال' ہی ہے۔

حضرت عیسیٰؑ سے متعلق کچھ ایسے ہی نظریات کا اعادہ کیا۔

> ''عیسائیت میں حضرت عیسیٰؑ کو ہی 'اول و آخر'، 'مالک کل'، 'ازل تا ابد'، بتایا گیا ہے نیز حضرت مسیح ہی ان مذکورہ عہدوں کے حقدار ہیں۔ پیروکارانِ حضرت عیسیٰؑ نے قدیم یونانی فلسفیوں کے فلسفہ حیات، فلسفہ زمان کو اپنے تئیں ٹھوس دلائل سے مسترد کیا، ارسطو نے فقط 'حال' کی حمایت کی تھی اور زمانی حوالے سے 'حال' کو ہی تسلیم کیا تھا، ماضی اور مستقبل کے انکاری ارسطو کی بات کو سینٹ آگسٹائن (۳۵۴۔۳۰۰ء) نے زمانی ترتیب کو واضح کر کے مسترد کیا جو کہ درج ذیل ہے۔ ۱۔ ماضی: گزرے ہوے واقعات سے منسوب حال ۲۔ حال: گزرتے ہوئے واقعات سے منسوب حال ۳۔ مستقبل: آنے والے واقعات سے منسوب حال'' [۱]

اسلام میں 'عصر' کے متعلق مخصوص حوالوں سے مختلف مقامات پر وضاحت کی گئی ہے قرآن مجید میں پارہ نمبر ۳۰ میں ۱۰۳ نمبر سورہ ہے جس کا نام ''والعصر'' ہے جس میں خدا 'زمانے کی قسم' کھا رہا ہے۔ گویا اسلام میں بھی 'زمان' کو اہمیت حاصل ہے نیز 'عصر' کوئی ایسی اہم شے ہے جس کی قسم کھا کر خدا نے اپنے کلام کا آغاز کیا ہے۔ علمائے اسلام نے سورہ والعصر کے متعلق بہت کچھ بیان کیا ہے۔ امام شافعی کہتے ہیں: ''اگر لوگ اس سورہ کو غور و تدبر سے پڑھیں اور سمجھیں تو یہ ایک سورہ کافی ہے''۔[۲] قرآن مجید میں بعض مقامات پر 'زمان' کو تقدیر بھی کہا گیا ہے فلاسفہ نے 'زمان' کی تعریف 'حرکت کی مقدار' بھی کی ہے۔ علامہ محمد حسین طباطبائی 'زمان' کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''ہم اپنے ارد گرد کچھ حوادث کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ ان میں سے بعض حوادث دوسرے حوادث کے بعد متحقق ہوتے ہیں، اس طرح کہ جو حادثہ بعد میں واقع ہوتا ہے اس سے پہلے والے حوادث ہر اس طرح متوقف ہوتا ہے کہ پہلے اور بعد والے حوادث کو جمع کرنا ناممکن بناتا ہے''۔[۳]

اسلام نے 'زمان' کے معنی و مفہوم میں بے پناہ اضافہ کیا ہے۔ اسلام نے زمانے کو تقدیر و مقدر سے منسلک کیا ہے قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے کہ: ''خلق کل شی فقدر لا تقدیر'' (خدا نے ہر چیز کو پیدا کیا اور اس کا اندازہ و تقدیر کو مقرر کیا)''[۴] اسلامی تعلیمات کی رو سے زمان، تقدیر و مقدر کے زیر اثر وقوع پذیر ہونے والے واقعات خدا کی مرضی کے بغیر کسی طور بھی ممکن نہیں ہیں، خدا ہی پہلی اور آخری کڑی ہے، مالکِ کائنات کی ذات ہی سے باقی سب کڑیاں جنم لیتی ہیں۔ اسلامی تعلیمات کے حوالے سے خدا کے علاوہ کوئی بھی تقدیر پر قادر نہیں ہے۔ حدیث قدسی میں ہے کہ: ''لاتسبو الدھر فانی انا الدھر'' (زمانے کو برا نہ کہو میں ہی زمانہ ہوں)۔[۵]

مذکورہ بالا بیان کیے گئے تمام نظریات سے ایک بات واضح طور پر اخذ کی جا سکتی ہے کہ 'رب التاریخ'، ابد، ازل، الدھر، العصر، ایک ہی مینارہ نور سے پھوٹنے والی کرنیں ہیں۔ پرانے عقائد اور ادیان کے علماء کے ساتھ ہر دور کے فلسفیوں، منطقیوں نے اپنی اپنی فکری رسائی تک 'عصر'، زمان کی تعریفیں کی ہیں، ارسطو کے نزدیک ''زمانہ محض حرکت کی ناپ ہے''۔ مگر افلاطون کے نزدیک ''خدا اور اس کے مظاہر فطرت ہی زندگی کی علامت ہیں اور یہی زمانہ ہے''۔[۶]

جدید فلسفیوں کے مطابق جو زمانی وقوع پذیری کے عمل میں ہوتا ہے وہ گزرے ہوئے وقت سے بہترین عناصر اپنی نشوونما کے لئے حاصل کرتا ہے۔ جدید فلسفی دریدا کے مطابق: ''زمانہ مستقبل اور زمانہ ماضی کی ہر دو زمانی صورتیں، زمانہ حال کی نسبت سے ہی اپنی شناخت کا حوالہ بن کر ماضی اور مستقبل کی دونوں صورتوں میں ڈھل

کر شعور کا جزو لاینفک قرار پاتی ہیں''۔ ے

عصر کی ماہیت کے تعین کے لیے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ عصر یا زمان ہی ایسا تصور ہے جو اول و آخر بھی ہے اور موجود بھی اور ایسا موجود جو لا موجود کے حدوں میں بھی داخل ہے۔ ماضی کے دھندلکے اسے چھپا نہیں سکتے اور مستقبل کی ان دیکھی دوری اسے دور کرنے سے قاصر ہے۔ عصر ایسی اکائی ہے جو ماضی، حال، مستقبل کے یکجا ہونے پر وجود میں آتی ہے اور ان تینوں زمانی حالتوں کی مسلم حقیقت کا نام ہی ''عصر'' ہے۔ عصر زمانہ مخصوص نہیں بلکہ کُل زمانہ 'عصر' کے ضمن میں آئے گا اور اگر اس بات کو یوں واضح کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ 'عصر' ماضی سے حال اور حال سے مستقبل تک مسلسل جاری رہنے والے 'زمان' کا نام ہے۔ حسیت کے حوالے سے احتشام علی یوں رقمطراز ہیں:

> ''حسیت انسانی ذات کا وہ مظہر قرار پائے گی جس کے ذریعے انسان نہ صرف جمالیاتی حواس خمسہ کے ذریعے اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے بلکہ اخلاقی سطح پر دوسروں کے دکھ درد اور اجتماعی مسائل کا دراک کر کے اپنے اشرف المخلوقات ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہے''۔ ۸

گویا انسانی اقدار کی مکمل پاسداری، انسانیت کے دکھ درد کو محسوس کرنا، مسائل میں ایک دوسرے کو اپنے ہونے کا احساس دلانا، مشکلات میں شانہ بشانہ ساتھ دینا یعنی منصبِ انسانیت کی ذمہ داریوں سے آگہی و پاسداری کا نام عصری حسیت ہے۔ بقول حالؔی:

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ

جب عصری حسیت انسان میں کسی بھی پہلو سے اجاگر ہوتی ہے تو زمانے میں موجود ظالموں، شعبدہ بازوں، بازی گروں، لٹیروں، کے کسی بھی انسان کے ساتھ کیے گئے ظلم کو نہ صرف اپنے ساتھ کیا گیا ظلم سمجھتا ہے بلکہ اُس کے سدِ باب کے لیے بے چین رہتا ہے اور ہر اُس ذی روح کو اس سے محفوظ رکھنا چاہتا ہے جو معاشرے کے نا مساعد حالات کا شکار اس وجہ سے ہوتے ہیں کہ یا تو وہ اپنے حقوق سے آگاہ نہیں ہوتے یا پھر وہ کسی مسیحا کے منتظر ہوتے ہیں۔

زمانے کے ارتقائی عمل کے ساتھ جہاں مسائل میں اضافہ ہوا ہے وہیں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ لوگ اپنے حقوق کے لیے بھی آواز بلند کر رہے ہیں اور ظلم و زیادتی کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونے کا عمل صرف نچلی سطح تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس کی گونج اقتدار کے ایوانوں میں بھی سنی جا سکتی ہے۔ آج کے اس جدید دور میں

جہاں سائنس نے انسانوں کے درمیان فاصلوں کی فصیلوں کو گرا دیا ہے وہیں انسان کو مصروفیت کے خول میں اس قدر جکڑ دیا ہے کہ ساتھ ہوتے ہوئے بھی دوری کا سماں معلوم ہوتا ہے۔

حسیت کو اگر ادب میں دیکھا جائے تو اس کے ڈانڈے منطقیت پسندی کے ردِ عمل کے طور پر آنے والے نظریات سے جا ملتے ہیں۔ اٹھارہویں صدی کے آخر میں حسیت بطور تحریک مغربی ادب کے افق پر نمودار ہوئی اور سب سے پہلے مغربی نثر نگاروں نے اسے اپنی تحریروں میں جگہ دی۔ اس وقت ادب میں حسیت کی ساتھ نئی نویلی دلہن جیسا سلوک کیا گیا بعض ادبا نے اسے جذباتیت سے متشابہ قرار دیا تو بعض نے اسے احساس گریہ وغمگساری قرار دیا۔ لیکن جلد ہی حسیت کو ایک قابل ذکر مقام ملنے لگا اور سستی جذباتیت سے مشابہ قرار دی جانے والی حسیت کو انسانی ذات کا مظہر قرار دیا گیا۔ کسی بھی فن پارے میں جب تک اس دور کا موجودہ زمانہ اپنے تمام تر عناصر کے ساتھ جلوہ افروز نہ ہو تو فن پارہ قبولِ عام کی سند حاصل کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ اگر عالمی ادب کو دیکھا جائے تو ایسا ادب ہمیشہ ہمیں کلاسیک کی فہرست میں نظر آئے گا جس میں مذکور زمانے کی حسیت اپنے مکمل اجزائے ترکیبی میں ضم ہو کر سامنے آئے۔ ایسا فنکار اپنے تخیل کی پرواز کے ساتھ ساتھ جب معاشرتی حسیت کو بھی درک کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے تو وہ اپنے فن پارے میں آفاقیت کی روح پھونک دیتا ہے۔

مغربی ادب میں حسیت کو سست روی سے قبول کیا گیا اور اسے ایک مخصوص عہد سے منسوب کر کے اس کی اہمیت کو محدود کیا جاتا رہا مگر سست روی کے باوجود اس کے اثرات دور رس رہے۔ عصری حسیت کسی فن پارے کا وہ ظاہری خول نہیں کہ جسے اُتار پھینکنے کے بعد ہی قاری اس کی اصل تک پہنچتا ہے بلکہ عصری حسیت تو وہ ذائقہ ہے جو اصل کے باطن میں کہیں چھپا ہوا ہے اور یہ ایک حقیقی فنکار کی نشانی ہے کہ جیسے ہی اس کی تخلیق کی پرتیں اٹھتی جاتی ہیں ویسے ویسے اس کا زمانہ ہمارے سامنے آشکار ہونے لگتا ہے۔ اس کے لیے ضروری نہیں کے قاری اور تخلیق کار یک زمانی ہوں بلکہ یہ عصری حسیت کا کمال ہے کہ ماضی کو حال میں ایسے سامنے لاتی ہے کے وہ حال کا حصہ معلوم ہونے لگتا ہے اگر یوں کہا جائے کہ عصری حسیت ایسی زمانی زنجیر ہے جو انسان کو آپس میں جوڑے رکھتی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

(ب) سیاسی وسماجی شعور:

انسان نے جب سے زندگی کا آغاز کیا ہے تب سے اس ضرورت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے کہ کوئی ضابطہ ایسا ہونا چاہیے جس کے تحت موجودہ زندگی کے خدوخال کو سنوارا جا سکے تا کہ مخصوص گروہی یا اجتماعی

زندگی کو بہ طریق احسن گزارا جائے۔ انسان کی زندگی ایک مسلسل جاری رہنے والے سفر کی مانند ہے۔ ایک ایسا سفر جس میں بہت سی رکاوٹیں، دُشواریاں ہمہ وقت موجود رہتی ہیں۔ مگر دُشواریوں کے باوجود سفر جاری وساری رہتا ہے۔ جس سے مُراد یہ ہے کہ انسان کی زندگی میں ہر وقت نئے مشاہدات و تجربات کی بدولت رجحانات، رویے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ جس سے تبدیلی کی فضا قائم رہتی ہے۔

اگر افراد سُرعت کے ساتھ اپنے اردگرد کے اور بین الاقوامی ماحول سے ہم آہنگ نا ہوں پورا معاشرہ میں تحرک کی جگہ جمود لے لیتا ہے۔ جس کی وجہ سے انسان کے شعوری سفر سے عملی اقدام تک ٹھہراؤ کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ حقیقت میں ارتقا کی جانب یہ سفر انسان کے شعور سے متعلق ہے۔ انسان کا شعور تخیل اور عمل کے درمیان ایک پُل کا کردار ادا کرتا ہے۔ انسانی شعور اپنے اردگرد کے ماحول سے استفادہ کرتا ہے اور جب یہ صورتحال اجتماعی سطح پر ہوتی ہے تو اس کے اثرات پورے معاشرے پر پڑتے ہیں۔ سماج میں موجود افراد کی سرگرمیاں، ضروریات، عمل، ردِعمل سب شعور کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ انسان جس طاقت کے زیرِنگیں کارہائے روزمرہ انجام دے رہا ہوتا ہے اُسی کو ''شعور'' کہتے ہیں۔ گویا انسانی تاریخ کی مسلسل ارتقائی صورتحال اس کے شعور کا ارتقا ہے۔

انسان کو معاشرتی حیوان کہا جاتا ہے۔ انسان کا عمل اس کے معاشرے میں رائج اقدار کے مطابق ہوتا ہے۔ فرد سماج کی پیروی کرتا ہے اور سماج فرد کے لیے وسائل فراہم کرتا ہے۔ جس سے وہ اپنی روزمرہ زندگی کے خدوخال کا تعین کرتا ہے۔ انسان کو گروہی زندگی کے آغاز سے ہی اس بات کا احساس شدت سے ہوا کہ زندگی کو منضبط انداز میں گزارنے کے لیے کُچھ ایسے اصُول وضع کیے جائیں، جن پر عمل کر کے زندگی کو بہتر انداز میں گزارا جا سکے۔ کسی بھی شے کی ضرورت اُس کے ہونے کا عندیہ دیتی ہے۔ اسی لیے قوانین کی کی ضرورت نے ہی ان کو جنم دیا۔ جن میں حاصل ومحصول، طلب ورسد کے قوانین ابتدا میں انسان نے وضع کیے۔

جن قوانین کی معاشرہ پیروی کرنے لگ جاتا ہے وہ ریاستی قوانین کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور ریاست کے قوانین کی پاسداری افرادِ معاشرہ کا فرضِ اولین بن جاتا ہے۔ ریاستی قوانین کا یہ نظام ہی دراصل سیاست کا نظام ہے۔ جس میں ریاستی نظم ونسق، جنگ وامن اور ریاستی عملداریاں شامل ہوتی ہیں۔ قدیم ومعروف لغت فرہنگ آصفیہ میں سیاست کے معنی ملکی نگرانی، انتظام وانصرام[۹] وغیرہ کے ہیں۔

یعنی لغوی معنوں میں بھی سیاست سے مراد ملکی انتظام وانصرام، حفاظت ونگرانی، حکومت وسلطنت کے ہیں۔ اور اصطلاحی اعتبار سے بھی یہ لفظ کم وبیش انہی معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ بنیادی طور پر سیاست

معاشرے میں موجود افراد کے لیے ایک ضابطہ ہے۔ جس کے تحت وہ اپنی زندگی گزارتے ہیں۔ وکی پیڈیا پر سیاست کی وضاحت ان الفاظ میں موجود ہے: شہروں کے معاملات سے تعلق رکھنے والے فیصلوں کو ایک گروپ کے ممبروں پر لاگو کرنے کا عمل ہے۔ یہ ایک انسانی برادری خاص طور پر ایک ریاست پر حکمرانی کے عہدوں کو حاصل کرنے اور مشق کرنے کا اشارہ کرتا ہے۔ مزید برآں سیاست معاشرے کے اندر وسائل کی تقسیم کا مطالعہ یا عمل ہے۔[۱۰] سیاست داخلی و خارجی دونوں طرح سے ملکی سلامتی کا نظام ہے۔ ریاست کے اداروں کے درمیان بروقت روابط، پالیسی کی سمت کو تعین کرنا اور جانچ پڑتال کے بعد اس کا اطلاق کرنا سیاسی نظام کے داخلی پہلو ہیں۔ فرد اور ریاست کے درمیان مستقل بنیادوں پر تعلقات کو قائم رکھنا تا کہ افرادِ معاشرہ ریاستی امور پر بھرپور طریقے سے اعتماد کرتے ہوئے عمل کریں۔

اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ آج کل سیاست کے معنی منفی طور پر ہمارے سامنے آ رہے ہیں مگر در اصل انسانی زندگی کی معاشرتی اصلاح، معاشی ضروریات کا تعین اور ان کا صحیح استعمال، تعلیمی راستوں کا تعین سیاست کے نظام کے داخلی پہلوؤں سے تعلق رکھتی ہیں نیز تمام دنیا سے تعلقات کی استواری اور خارجہ پالیسیوں کا اپنے ملک کی سالمیت کو پیشِ نظر رکھ کر ترتیب دینا خارجی پہلوؤں سے تعلق رکھتا ہے۔ سیاست عوام اور ریاست کے درمیان ایسے ناگزیر تعلق کا نام ہے جس میں عوام بغیر کسی خارجی مفاد کی بھینٹ چڑھے اپنے حق تک رسائی حاصل کرے۔ ہمارے معاشرے میں سیاست عوامی رائے سے زیادہ طاقت کے استعمال سے عمل میں آتی ہے۔ عمومی طریقہ کار کے مطابق لوگ منضبط طریقہ کار سے عمل درآمد کروانے کے لیے ایک مقتدر قوت بنا دیے جاتے ہیں، اس اطلاقی عمل کے بعد وہی لوگ کاروبارِ سلطنت سے متعلق امور کی انجام دہی کے ذمہ دار قرار پاتے ہیں۔

انسان فطرتی طور پر طاقت کا خواہاں ہوتا ہے۔ قدیم دنیا سے لے کر آج کی مہذب دنیا تک انسان کے لیے معاشرے پر حکمرانی کبھی نہ ختم ہونے والی خواہش رہی ہے۔ گو کہ اس کے طریقے بدل گئے ہیں۔ مگر انسان آج بھی لوگوں پر حکمرانی کرنا چاہتا ہے۔ طاقت و اقتدار کی جنگ میں انسان نے بہت سے نقصان بھی اُٹھائے ہیں۔ انسانی تاریخ طاقت و اقتدار کے نتیجے میں ہونے والی خونریزیوں سے بھری پڑی ہے۔ مگر اقتدار کی آگ کبھی بجھی نہیں بلکہ ہمیشہ پہلے سے زیادہ بھڑک اُٹھتی ہے۔

موجودہ نظامِ سیاست میں سیاست ایک 'اجتماعی عمل' کے طور پر ہمارے سامنے آتی ہے۔ یہ بات بھی یقینی ہے کہ جس طرح سیاست کے ثمرات اجتماعی ہوتے ہیں تو نقصانات بھی اجتماعی ہوتے ہیں۔ سیاسی غور و فکر کا

مرکز ریاست ہوتی ہے ۔ جہاں افراد ایک مخصوص نظام کے تحت اپنی زندگی گزارتے ہیں ۔ سیاست ایک ایسا جامع نظام ہے جو زندگی کے ہر شعبے پر اثر انداز ہوتا ہے ۔ سیاست فرد سے ریاست تک دائرہ بناتی ہے ۔ جہاں فرد کے بنیادی حقوق کا تعین کر کے ہر فرد کی رسائی ممکن بنائی جاتی ہے، وہیں ریاست کے لیے نظامِ حکومت کا تعین بھی ہوتا ہے ۔ جمہوریت کا فروغ بھی سیاست کے پیشِ نظر ہوتا ہے اور آمریت کی روک تھام بھی سیاست کے نظام کے تحت ممکن ہے ۔ گویا سیاست کے ذریعے معاشرے میں ایسے نظامِ حکومت کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے جس میں فرد خوشحال زندگی کے خواب کو شرمندہ تعبیر کر سکے ۔

گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ سیاست ایک ایسا اجتماعی معاشرتی عمل ہے، جس میں معاشرے کا ہر فرد اس عمل کا حصہ ہوتا ہے ۔ نیز اس میں خالصتاً عوامی بھلائی کا عنصر پوشیدہ ہے ۔ نامور ادیب ڈاکٹر رشید امجد کہتے ہیں :''سیاست ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنی پورے دور کی تمام قدروں سے متعین ہوتے ہیں'' ۔[۱۱] موجودہ اقتباس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سیاست میں موجود زمانے کی تمام قدروں کا ہونا ضروری ہے، البتہ گزرتے وقت اور قدروں میں تبدیلی کے ساتھ سیاست کے لفظ و معنی میں بھی کئی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں ۔ سیاست مملکت کے اندرونی و بیرونی نظام میں نافذ العمل قوانین کے مسودے کا نام ہے اور اگر اندرونی سطح پر اقدار و سیاست میں کہیں بھی فرق ہو تو سماج ایک مشین کی طرح ہو جاتا ہے، جو اپنے مالک کے کہنے پر کام کرے اور اعمال بجا لائے وگرنہ بغیر کچھ کہے اپنی عملی موجودگی کا احساس نہ دلائے نہ جذب و کیفیت کی منزل، نہ جلوت کا جلوہ نہ خلوت کی آرزو، کچھ بھی ایسا نہیں ہوتا جو انسانی ضرورتوں کی عکاسی کر سکے ۔ جس کے نتیجے میں قوانین کی پاسداری کا فقدان بڑھنے کا خدشہ بہر حال موجود رہتا ہے اور معاشرہ زوال پذیری کا شکار ہوتا ہے ۔

ریاست کی کامیابی معاشرے میں خوشگوار فضا پر منتج ہے ۔ یہ فضا اسی وقت تا دیر قائم رہ سکتی ہے جب ریاست کا اقتصادی سفر درست سمت میں ہو رہا ہو گا ۔ بعض منصوبے یا پالیسیاں ایسی ہوتی ہیں جن کے منفی اثرات ریاست کی کامیابی کے لیے خطرہ ثابت ہوتے ہیں ۔ سیاست ہی وہ نظام ہے جو ریاست کو اُن اندرونی یا بیرونی غلط پالیسیوں سے نکال کر ہونے والے نقصانات سے بچاتا ہے ۔ اگر بر وقت خطرات کا حل تلاش نہ کیا جائے تو معاشرہ انتشار کا شکار ہو جاتا ہے ۔ جس سے مساواتی نظام طبقاتی نظام میں تبدیل ہونا شروع ہو جاتا ہے ۔ مساوات کی فضا کو مشہور ریاضی دان فیثا غورث نے اپنے اعداد کے شمار سے سمجھانے کی کوشش کی ہے : ایک عدد اس وقت تک سالم رہتا ہے جب تک اس کے اجزاء برابر ہیں ۔ سیاست کی بناء انصاف پر اس وقت تک رہتی ہے جب تک اس کے اجزاء میں مساوات ہو اور انصاف کا مقصد ہی اس مساوات کو قائم رکھنا ہوتا ہے ۔[۱۲]

یعنی افراد معاشرہ سے مساواتی برتاؤ ریاست کا اولین فرض ہے۔اسی میں معاشرے کی بقاء کا راز مضمر ہے اور ریاست کا بھی۔سیاسی نظام سماج کے اندر مساویانہ نظام کے قیام اس کے اصول وضوابط اور طریقوں کے متعلق مواقع فراہم کرتا ہے۔لیکن سیاسی نظریات اور کارگزاریوں میں تفاوت ماحول میں موجود متضاد قوتوں کی مزاحمت کی وجہ سے ہوتا ہے۔سیاسیات کی اساس حقیقت پسندی پر مبنی ہے۔اس کو محض مذہبی، لسانی، علاقائی و دیگر دائروں میں محدود کرنا فرد اور معاشرے دونوں کے لیے بلواسطہ اور ریاست کے لیے بلا واسطہ صحیح نہیں کیونکہ ان دائروں سے ماورا ہو کر ہی صحیح مساوی نظام کی تشکیل ممکن ہوسکتی ہے۔جس کے لیے اقتصادی اصلاحات کو سیاسی نظام میں ترجیح دینا ہوگی۔کارل مارکس اسی بات کو مزید واضح انداز میں کہتا ہے کہ انسان سیاسی حیوان نہیں بلکہ معاشی حیوان ہے۔[۱۳]

سیاست معاشرے میں موجود فن و ادب پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ادب اور سیاست کا ربط بہت گہرا ہے۔کیونکہ ادب کا موضوع انسان کی زندگی کے گرد گھومتا ہے اور سیاست اس زندگی کے طور طریقے وضع کرنے کا نام ہے۔اشفاق حسین سیاست کے دائرہ کار کے حوالے سے کہتے ہیں۔''سیاست کے دو دائرے ہیں ایک وہ جو معاشرے کے ظاہر و باطن پر محیط ہے اور جس کی رو سے ہر وہ سرگرمی جس سے معاشرتی سرگرمی متاثر ہو مذہبی ہو یا غیر مذہبی، ادبی ہو یا معاشی کاروبارِ سیاست کا حصہ ہے۔دوسرا دائرہ سیاست کا محدود دائرہ ہے جس کا تعلق معاشرے کے آئینی، قانونی، معاشی نظم ونسق سے ہے''۔[۱۴] معاشرے یا سماج کا رشتہ سیاست سے اس وقت مضبوط ہوگا جب سماجی اقدار کو منظّم انداز میں قابلِ عمل بنایا جائے گا۔کیوں کہ جن اصولوں پر سماج کی بنیاد ہوتی ہے انہیں سیاست بناتی ہے۔سماج کے قوانین، اداروں پر سیاست کی گہری چھاپ ہوتی ہے۔جس قدر مضبوط پالیسیوں سے ادارے قوانین کی پاسداری کریں گے معاشرہ اتنی جلدی ترقی کی جانب گامزن ہوگا جس سے فرد کی زندگی میں خوشحالی آئے گی۔مکمل اور زندی سماج وہی قرار پاتے ہیں جو اچھی سیاست کی بدولت آگے بڑھتے ہیں۔

سیاست اور سماج کا محور فرد ہے۔فرد کی بہتری وفلاح کے لیے قوانین سیاست کا نفاذ کیا جاتا ہے۔سماج افراد کا مجموعہ ہے اور ان افراد میں کس کی بات کیسے سُنی جائے، اس کے مسئلے کا حل کیسے نکالا جائے کہ دوبارہ اسے ان کا سامنا نہ کرنا پڑے نیز مختلف نقطہ ہائے نظر، سوچ، دلائل و براہین میں کیسے توازن برقرار رکھا جائے یہ تمام کارہائے ضروری سماج کی سیاست ہی طے کرتی ہے۔

سیاست سے فرد کا تعلق تاریخی تناظر کا ہے۔جس میں زمانہ قدیم کے افراد کی گروہی زندگی، معاشرتی

ضروریات و مسائل، تہذیب و تمدن وغیرہ پنہاں ہے۔ فرد کا یہ ارتقائی سفر در اصل جہاں سیاست کا ارتقاء ہے وہیں تاریخ کا بھی ارتقاء ہے۔ ریاست میں رائج سیاسی نظام تحت زندگی گزارنے والے انسانوں کی بنیادی ضروریات کے حصول کے لیے ذرائع کا فراہمی ریاست کا اولین فرض ہے۔ جن میں سب سے پہلے عدل و انصاف کی فراہمی، صحت کی بہتری کے لیے اقدامات، تعلیمی ضروریات کا خیال رکھنا وغیرہ شامل ہیں۔ عدل و انصاف کی فراہمی سے ریاست اور فرد کا تعلق مزید گہرا ہوتا ہے۔ افلاطون نے اپنی کتاب (ریاست) میں جس چیز کو ریاست کے لیے ناگزیر تصور کیا ہے وہ عدل ہی ہے۔ افلاطون کے نزدیک ''اگر ریاست میں کامل ربط اور اتحاد درکار ہے تو دانائی، ہمت اور اعتدال کے عناصر کو عدل کے ذریعے سے ہم آہنگ کرنا چاہیے''۔ ۱۵ یعنی عدل معاشرے میں اتحاد کی فضا کا ضامن ہے۔ عدل کا مطلب صرف فیصلے میں انصاف نہیں بلکہ ریاستی حوالے سے عدل کے معنوں میں جامعیت موجود ہے۔ فرد سے لے کر من حیث القوم نظام سے پہلے اپنے آپ پر عدل کو لاگو کرنا ہوگا۔ اپنے روز مرہ کے کام، دوسرے لوگوں سے برتاؤ، لین دین، ریاستی امور میں مثبت کردار کے ذریعے حصہ ڈالنا وغیرہ گویا زندگی کی ہر سطح پر عدل کا نفاذ کرنا ہوگا۔

افرادِ معاشرہ کا سیاسی نظام کو اپنے فہم و ادراک کے مطابق سمجھ کر قوانین کے نفاذ اور معاشرے کو بہتر بنانے کے لیے اپنا کردار ادا کرنے کا نام ہی شعور ہے۔ شعور در اصل گنجینہء معانی و مفاہیم کی کلید کا نام ہے۔ جس سے تفہیم کے بہت سے پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔ شعور خود آگہی کا لا متناہی سلسلہ ہے۔ اس موقع پر شعور کی وضاحت ضروری ہے کیونکہ آنے والی مباحث میں شعور کے مفہوم کو با آسانی سمجھا جا سکے۔ علامہ طباطبائی نے شعور کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''شعور ادراک کے معنوں میں دقیق ہے۔ اس کا مادہ شُعر ہے جس کا مطلب بال ہے۔ لہذا کسی چی ز کا ادراک اس قدر دقیق و باریک ہے جیسا کہ باریک بال ہوتا ہے۔ شعور پڑھنا یا کہنا اور اس کلمہ یا لفظ کا استعمال اور تعلق محسوسات سے نہیں زیادہ ہے معقولات سے نہیں۔ اسی سبب سے حواس ظاہری کو مُشاعر کہتے ہیں''۔ ۱۶

گویا شعور احساس و جذبات کے اُجاگر ہونے کا نام ہے۔ جب کسی بھی عمل میں انسان اپنے حواس ظاہر یکے توسط سے آگہی کے عمل سے گزرتا ہے تو گویا وہ اس فعل کو شعوری طور پر سرانجام دے رہا ہوتا ہے۔

وکی پیڈیا پر شعور کے ضمن میں لکھا ہے کہ '' شعور اصل میں عقل کی ایسی کیفیت کو کہا جاتا ہے جس میں

ذاتیت، فہم الذاتی، دانائی اور اگاہی کی خصوصیات پائی جاتی ہوں اور ذاتی اور ماحولی حالتوں میں ایک ربط موجود ہو''۔ ۱۷ مذکورہ اقتباس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ شعور ذاتی آگاہی سے اجتماعی معاشرتی آگہی کا مصدر ہے جو انسان کی معلومات میں مسلسل اضافے کا باعث بنتا ہے۔ شعور کے ذریعے ہی حیوان و انسان میں فرق ممکن ہے۔ مارکس شعور کو فرد کی سیاسی آگاہی سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی امورِ سیاست کو انفرادی و اجتماعی بنیادوں پر اقتصادی تناظر میں رکھ دیکھنا ہی سیاسی شعور ہے۔ سیاسی شعور ایسا حسیاتی عمل ہے جو فرد کو معاشرے کے تمام خصائص و نقائص سے آگاہی فرہم کرتا ہے۔ سیاسیشعور کی بدولت فرد سیاسی ریاست کے امور پر نگاہ رکھتا ہے تا کہ اپنے بنیادی حقوق تک رسائی حاصل کر سکے۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی اپنے مشاہدے میں لائے کہ آیا ریاست وہ تمام ذرائع بروئے کار لا رہی ہے جن سے فرد کی ذہنی و مادی ترقی کو ممکن بنایا جا سکتا ہے۔

شخصیت کی تربیت کے لیے ماحول مہیا کرنا ریاست کا فریضہ ہے۔ ویسے تو مطلقاً شعور کی پختگی میں ماحول کا عمل دخل ہوتا ہے۔ لیکن سیاسی شعور خالصتاً ماحول پر منحصر کرتا ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے آج کے انسان کے سیاسی شعور اور آج سے پانچ یا دس دہائی قبل زندگی گزارنے والے انسانوں کے سیاسی شعور کے تجزیے سے بخوبی سمجھی جا سکتی ہے۔ جیسے جیسے ماحول ارتقائی منازل طے کرتا ہے ویسے ویسے افراد کا شعور بھی منازل طے کرتا جاتا ہے۔ جس سے شعور میں تبدیلی کے ساتھ پختگی آ جاتی ہے۔ چونکہ زمانہ قدیم میں ارتقائی عمل سست روی کا شکار تھا جس کی وجہ سے ذہنی ارتقاء بھی اسی انداز سے پھل پھول رہا تھا۔ لیکن جیسے ہی انسان نے تخیل سے تعبیر اور تجربے کی منازل کو طے کیا تو ماحولیاتی تبدیلیاں بھی اُسی سُرعت سے رونما ہونے لگیں۔ جس کی وجہ سے انسان نے ان کو شعوری طور پر قبول کیا اور خود کو ان کے مطابق ڈھالنا شروع کیا۔ انہیں تبدیلیوں کی بدولت ہی انسان کی ضرورتوں نے انگڑائی لی اور ایجادات کے نئے در وا ہوئے۔ یوں تبدیلی کی لہر انسانی زندگی پر مکمل طور پر اثر انداز ہوتی ہے۔ سیاسی تبدیلیاں ہمیشہ سے انسانوں کو دیگر معاشرتی تبدیلیوں کی بدولت زیادہ متاثر کرتی ہیں۔

انسان کا آغاز گروہی زندگی سے ہوا۔ انسان نے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اجتماعی زندگی گزارنے کے طریقے وضع کیے۔ ان کے اطلاق کے لیے انسان مختلف گروہوں کی تنظیم کرتا ہے اور انہیں ماحول کے مطابق منظّم کرتا ہے۔ جب انسان کا سیاسی شعور سماج اور اس میں موجود اقدار کی تفہیم کے حوالے سے کروٹ لیتا ہے تو جس سوچ کے تحت وہ سماج کی تفہیم کرتا ہے اُسے سماجی شعور کہتے ہیں۔ شعور کی تعریفات گزشتہ صفحات پر بیان کی جا چکی ہیں یہاں سماج کی وضاحت کی جائے گی تا کہ سماجی شعور کو سمجھنے میں مدد ملے۔ سماج یا معاشرہ انگریزی

لفظ SOCIETY کا مترادف ہے ۔ آج کل کے جدید دور میں سماجیات ایک علم کی صورت میں ہمارے سامنے سماج اور اس کے مندرجات کو پیش کرتا ہے ۔ جسے سوشیالوجی SOCIOLOGY کہا جاتا ہے ۔ کشاف تنقیدی اصطلاحات میں سوسائٹی یا معاشرہ کی تعریف یوں کی گئی ہے ''سماجی تعلقات کو وہ نظام جس میں اور جس کے ذریعے ہم زندگی گزارتے ہیں ۔ معاشرہ یا سماج کہلاتا ہے ۔ سماجی تعلقات کا یہ نظام با الفاظِ دیگر ہمارا سماجی ماحول ، ہمارے اوہام وعقائد ، افکار وتصورات ، ہمارے فلسفہ حیات اور ہمارے کردار کی تشکیل وتعمیر میں بہت حد تک دخیل ہوتا ہے ۔ معاشرہ کا لفظ ادبی تحریروں میں سماجی تعلقات کے نظام کے علاوہ کبھی پوری انسانی برادری کے لیے کبھی ایک قوم کے لیے اور کبھی چند خاندانوں پر مشتمل ایک گروہ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے'' ۔ ۱۸؎ یعنی افراد جب باہمی مفادات کی خاطر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں تو اس کی بہت سی مشترک وجوہات ہوتی ہیں ، مشترک تہذیب وثقافت ، زبان ، رنگ ونسل اور مذہب وغیرہ ایسے افراد کے گروہوں کے درمیان ذہنی یک سوئی موجود ہوتی ہے ۔ جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں ۔ جس ماحول میں وہ اپنے مفادات ، ضروریات وغیرہ کی تکمیل کرتے ہیں دراصل وہی سماج یا معاشرہ کہلائے گا ۔

فرد اور سماج کا تعلق ناگزیر ہے ۔ دونوں ہر حال میں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں ۔ فرد کا تخیل جب اس کے گرد وپیش کے تجزیے کے بعد سامنے آتا ہے تو وہ دراصل اُس سماجی تفہیم کا نتیجہ ہوتا ہے جسے ہم سماجی شعور کہتے ہیں ۔ انسان کا سماجی شعور اس کے ماحول ، اندرون و بیرون دونوں سطح پر ہم آہنگی کے مراحل سے گزرتا ہے ۔ سماجی شعور کے ذریعے انفرادی تجربات اور اس سے حاصل شدہ نتائج سماج سے تعلق استوار کرتے ہیں ۔ فرد اور سماج کے اس تعلق میں ماحول کے ساتھ کُچھ اجتماعی افعال وسرگرمیاں بھی منظر عام پر آتی ہیں جو زندگی کے ہر پہلو سے اخذ شُدہ ہوتی ہیں یہ افعال وعادات ہی سماجی قدریں کہلاتی ہیں ۔ کشاف تنقیدی اصطلاحات میں اقدار کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے ۔

> ''ہم جانتے ہیں کہ ہماری روز مرہ کی زندگی میں بعض معاملات یا اشیاء اہم سمجھے جاتے ہیں ، بعض غیر اہم ، بعض کو ہم عزیز جانتے ہیں اور بعض کو ہم حقیر گردانتے ہیں ۔ انہی ترجیحات کو اقدار کہتے ہیں اور انہی کے اعمال سے ہماری سماجی زندگی کا نقشہ بنتا ہے'' ۔ ۱۹؎

یعنی سماجی اقدار وہ بنیادیں ہیں جن پر ہماری مدنی زندگی کی عمارت قائم ہوتی ہے ۔ اقدار ماحول سے جنم لیتی ہیں اور ماحول سماج اور فرد کے باہمی اشتراک سے وجود میں آتا ہے ۔ گویا اقدار کو مدِ نظر رکھتے ہوئے

سماجی ضروریات کا ادراک اور اپنے تخیل کا آزادانہ اظہار و استعمال ہی انسان کا سماجی شعور ہے ۔ ہر انسان کا شعور یکساں نہیں ہوتا ۔ کسی کے تخیل کی پرواز زیادہ ہے تو کسی کی کم جس کا اظہار مختلف شعبہ ہائے حیات میں رہتے ہوئے کیا جاتا ہے ،مثال کے طور پر ایک شاعر کا سیاسی و سماجی شعور اور ایک بنکار کا سیاسی و سماجی شعور قطعی یکساں نہیں ہو سکتے ۔ کیوں کہ دونوں الگ الگ شعبہ ہائے حیات سے منسلک ہیں ۔ سماج انسان سے معاشرتی تنظیم چاہتا ہے سماج اور انسان کا تعلق ناگزیر ہے ۔ کیونکہ سماج ہی گروہ سے فرد اور فرد سے فرد کا تعلق قائم رکھتا ہے ۔ سماج میں بہت سے عناصر موجود ہوتے ہیں جو مل کر سماجی ضروریات کی تکمیل میں معاون ثابت ہوتے ہیں ان سب میں معاش سب سے اہم و کار آمد عنصر ہے ۔ کیوں کہ معاش کے نظام سے ہی انسان کی بنیادی ضروریات وابستہ ہوتی ہیں ۔ جہاں مادی ضرورتوں کے لیے انسان معاشی استحکام کا خواہاں ہوتا ہے وہیں فکری استحکام وضروریات کی تکمیل ادب سے ہوتی ہے ۔

ادب اور سماج کا تعلق بہت گہرا ہے ۔ ادب کا تعلق انسان کی زندگی سے ہوتا ہے اور سماج اس کے لیے ماحول فراہم کرتا ہے ۔ سماج کی تکمیل افراد سے ہے اور افراد کی شعوری تکمیل کا نام ادب ہے ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے ادب کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے ۔ ''ادب وہ فنِ لطیف ہے جس کے ذریعے ادیب جذبات و افکار کو اپنے جذبہ و احساس کے مطابق نہ صرف ظاہر کرتا ہے بلکہ زندگی کے داخلی و خارجی حقائق کی روشنی میں ان کی ترجمانی وتنقید الفاظ کے وسیلے سے کرتا ہے اور اپنے تخیل وقوتِ مخترعہ سے کام لے کر اظہار بیان کے ایسے موثر پیرائے اختیار کرتا ہے جن کے ذریعے سامع و قاری کا تخیل بھی تقریباً اسی طرح متاثر ہوتا ہے جس طرح خود ادیب کا اپنا تخیل اور جذبہ''۔[۲۰]

اس اقتباس سے ادب کا ایک جامع تصور سامنے آتا ہے وہ یہ کہ ادب کامل زندگی کا کامل ترجمان ہے اور ادب ہی کے ذریعے زندگی کے معاملات الفاظ کی صورت اختیار کرتے ہیں ۔ سید عابد علی عابد ادب کے دائرہ کار کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں :'' ادب کا موضوع انسان ہے اور اس کا منطقی تجزیہ کیجئے تو آخر بات یہیں آ کر ٹھہرے گی کہ دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں جو ادب کا موضوع نہ بن سکے''۔[۲۱] انسان کی تخیلاتی دنیا کا مادی دنیا میں مکمل اظہار ادب کہلائے گا ۔ سماجی شعور کی ارتقائی منازل میں جس چیز نے ہمیشہ سے اہم کردار ادا کیا ہے وہ ادب ہے ۔ ادب ہمیشہ سے سماج میں فکری ترسیل کا بہترین ذریعہ رہا ہے ۔ ادبی فن پارے کے ذریعے مختلف کرداروں کو معنوی ہیئت میں سماج میں موجود علامتوں سے منسوب کر کے پیش کیا جاتا ہے ۔ جس کا اولین مقصد سماج میں موجود مختلف فکریات کو اجاگر کرنا ہوتا ہے تا کہ درست سمت میں اس کی تفہیم کی جا سکے ۔ اس

طرح ادب کے ذریعے سماج کے مروجہ رسم و رواج ،اوہام وعقائد ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہو جاتے ہیں ۔ ہر دور کا نمائندہ ادب اپنے زمانے کا آئینہ ہوتا ہے ۔ جس میں اس دور کے غالب رجحانات و رویوں کو دیکھا جا سکتا ہے ۔ ہر دور کے نمائندہ ادب سے اس دور کے افراد کی فکری تصویر کشی ہوتی ہے ۔ اگر ادب انسانی زندگی کے معاملات کو اپنے دامن میں نہیں لیے ہوئے نہیں ہے تو وہ ایک عام سے تحریر تو ہوسکتی ہے لیکن نمائندہ ادب نہیں کہلا سکتا ۔ یعنی ادب صرف ادیب کی داخلی کیفیات کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ معاشرے کے اجتماعی رجحانات کا بیانیہ ہوتا ہے ۔ کیوں کہ تخلیق کار جس ماحول میں زندگی گزارتا ہے اس کے احساسات و جذبات ماحول کی گرفت میں پروان چڑھتے ہیں ۔ جو چیز اس کے مشاہدے میں آتی ہے اور اس کو متاثر کرنے میں کامیاب ہوتی ہے وہ اس کو اظہار اپنے انداز و الفاظ میں کرتا ہے ۔ اگر ادب معاشرے کے غالب نظریات سے خالی ہے تو وہ معاری ادب نہیں ہوسکتا ۔ مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں :''ہر ادبی کارنامے میں ان عصری میلانات و خصوصیات کا ہونا ضروری ہے ۔ آج محض حسن کاری کو ادب نہیں کہتے ۔ ادب اگر ملک اور زمانے کے تازہ ترین فکریات یعنی اجتماعی خیالات و افکار کا حامل نہیں ہے تو وہ صحیح معنوں میں ادب نہیں ہے''۔۲۲؎ گویا ادیب معاشرتی صورتحال سے لاتعلق نہیں رہ سکتا ۔ اگر لاتعلق رہے گا تو اپنے فرائض منصبی بہ طریق احسن انجام نہیں دے پائے گا ۔ ادیب معاشرے کا بیدار فرد ہوتا ہے جو عمیق نگاہی سے معاشرے کا جائزہ لیتا ہے اور پھر اپنا مشاہدہ مخصوص انداز میں بیان کرتا ہے ۔ ادب کا تعلق معاشرے کے کُل کے ساتھ ہے ۔ ہم یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ ادب میں فقط شاعری و فلسفہ بیان کیا جاتا ہے بلکہ بعض دفعہ ادب میں ان عوامل کا اظہار بھی ہوتا ہے جن کا ظاہراً ادب سے کوئی رشتہ نہیں لگتا ،مثال کے طور پر اقبال نے شاعری کے ذریعے ایک سوئی ہوئی قوم کو بیدار کیا ۔ اقبال نے اس وقت کی اہم ضرورت کو اپنی شاعری کے ذریعے پورا کیا ۔

ادب ہی وہ لطیف پیرایہ ہے، جس کے ذریعے داخل کے ساتھ خارج کو بھی نفاست کے ساتھ بیان کیا جا سکتا ہے، اور خارج و داخل ہی سماج اور ادب کا سنگم ہیں ۔ جہاں معاشرہ اپنے خارجی عوامل میں پُر سکون ہوتا ہے وہاں داخلی رجحانات سامنے آتے ہیں اور جہاں خارجی انتشار معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لیتا ہے تو تخلیق کار اس سے اثر قبول کیے بناء نہیں رہ سکتا اور اس کا اظہار وہ اپنی تخلیقات میں ضرور کرتا ہے ۔ تخلیق اور معاشرے کا رشتہ فطری ہے ،خواہ وہ ۱۸۵۷ء کے حالات کے درمیان ظاہر ہونے والے فن پاروں میں موجود سیاسی و معاشرتی صورتحال ہو یا نادر شاہ کے حملہ دلی کا دکھ اس وقت کے 'شہر آشوب' کی صورت میں، یہاں ادبی فن پارے اجتماعی صورتحال کا بیانیہ بن جاتے ہیں ۔ جو سماج میں اجتماعیت کو فروغ دیتے ہیں اور اجتماعی شعور کو پنپنے کا موقع فراہم

کرتے ہیں ۔ ہر زبان کا کلاسیک ادب جہاں اس دور کی تاریخ ہوتا ہے وہیں اس معاشرے میں بسنے والے افراد کی تہذیبی و ثقافتی سرگرمیوں کا عکاس بھی ہوتا ہے ۔ جس سے بعد میں آنے والے افراد اپنے آباء واجداد کی تاریخ وتہذیب سے آگاہی حاصل کرتے ہیں ۔

(ج) تاریخی وتہذیبی شعور:

تاریخ انگریزی لفظ HISTORY کا مترادف ہے جس کے لغوی معنی ہیں'' وہ علم جس میں گزشتہ اوقات اور سیر سے بحث کی جائے ، بادشاہوں نامور آدمیوں ، قوموں اور فرقوں کے حالات ، واقعات ، حادثات کا تحریری تذکرہ''۔۲۳ گویا تاریخ ایسے علم کو کہتے ہیں جس میں گزرے زمانوں کے بادشاہوں ، فاتحین ، مشہور شخصیات ، مذہبی راہنماؤں کے سیاسی ، سماجی ، معاشرتی حالات کے ساتھ ساتھ زمانے کے رسوم و رواج ، معاشرے میں رونما ہونے والے اہم واقعات وغیرہ کے متعلق معلومات موجود ہوں ۔ کشاف اصطلاحاتِ تاریخ میں وضاحت ان الفاظ میں موجود ہے ۔'' تاریخ انسانی زندگی کے گزشتہ واقعات ، تحریکات اور ان کے اسباب اور نتائج کے تحریری سرمائے کا نام ہے ۔ یہ انسان کے معاشرتی ، سیاسی ، مدنی ، ثقافتی اور مذہبی تصورات کی داستان ہے ۔ یہ روایاتِ کہن اور نقوشِ پارینہ کا خزانہ ہوتی ہے ۔ یہ ندی کے اس صاف و شفاف پانی کی مانند ہے جس میں اقوام اپنا چہرہ صحیح طور پر دیکھ سکتی ہیں''۔۲۴ گویا تاریخ انسان کی مکمل زندگی کو اپنے حصار میں لیے ہوئے ہے ۔ تاریخ ماضی کے جھروکوں میں جھانکنے کا نام نہیں بلکہ چشمِ تخیل سے اس میں زندگی گزارتے دیکھنے کا نام ہے ۔ علم التاریخ کے ذریعے گزشتہ زمانے کی معاشرت ، تمدن ، اخلاقی اقدار سے سیر حاصل واقفیت ہوسکتی ہے ۔ تاریخ سے متعلق ایک تعریف مندرجہ ذیل ہے :

> ''انسانوں کے یکجا ہو کر رہنے کو ، تمدن اور اس انسانی مجمع کو ، شہر ، مقام ، ملک اور ان مختلف حالتوں کو جو طبقاً اس کو عارض ہوں ، واقعات تاریخ اور پچھلوں کو پہلوں سے سُن کر ان واقعات کو اکٹھا کرنے اور اپنے سے پیچھے آنے والوں کی عبرت اور نصیحت کے لیے بطور نمونہ چھوڑ جانے کو 'تاریخ' کہتے ہیں''۔۲۵

گویا تاریخ مکمل انسانی زندگی کا احاطہ کرنے کے ساتھ ساتھ زندگی کے جزئیات کو بھی اپنے حصار میں لاتی ہے اور انسان اپنے زمانی حالات و واقعات کو جس آئینے میں دیکھتا ہے اُسے 'تاریخ' کہتے ہیں ۔ تاریخ کی مزید وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے :

> ''تاخیر کے جزو آخر کو اُلٹا کر کے لفظ تاریخ بنایا گیا ہے اور تاخیر کے معنی ہیں اولین وقت کو آخرین وقت کے ساتھ نسبت دینا ، مثلاً یہ بتانا کہ فلاں مذہب یا

فلاں سلطنت یا فلاں معرکہ فلاں وقت میں ظاہر ہوا تھا نیز جزیتاً یا کلیتاً جو بھی
واقعات اس وقت میں ظہور پذیر ہوئے ان سب کو معلوم کرنے کا مبداء یہی
وقت ہوتا ہے''۔[۲۶]

تاریخ کو آج کل کے دور میں ماضی کے چند واقعات کا احیاء سمجھا جاتا ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں، جبکہ تاریخ اور تاریخی شعور ماضی کے واقعات کے علاوہ زمانی اعتبار سے حال کے واقعات کا جائزہ ماضی کے واقعات کے روشنی میں لینا ہے۔ ہمارے ہاں غیر جانبدارانہ طریقے سے تاریخ فہمی ناپید ہوتی جا رہی ہے۔تاریخ فہمی کے لیے سب سے پہلے تاریخی حقائق کو تعصب کی عینک اُتار کر دیکھنا فرضِ اولین ہے۔جو کہ ہمارے معاشرے میں بہت مشکل ہے اور یہ بات طے ہے کہ جب تک تفہیمِ تاریخ منضبط طریقے سے نہیں ہوگی۔اُس وقت تک تاریخ کی تفہیم نہیں ہوگی۔تاریخ کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے جس چیز کو معلوم کرنا ہوگا وہ مورخ کی زندگی کا جائزہ ہے۔اگر مورخ اپنے زمانے کے موجود دربار سے وابستہ رہا تو موجود تاریخ پر یقین کرنا بہت مشکل ہوگا اور بدقسمتی سے ایسے مورخین ماضی کے محلوں نہیں ملتے۔جرمن مفکر رینک مورخ کے تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے'' جو تاریخی واقعات کو محنت و دیانت سے دریافت کر کے پیش کرتا ہے وہ درحقیقت مورخ کہلاتا ہے''۔[۲۷] اس تعریف کے تحت کوئی بھی مورخ ان اصولوں پر پورا نہیں اترتا۔ ماضی کی چند تحریروں کو چھوڑ کر کوئی ایسی منظم تاریخ ہمارے سامنے نہیں آتی جس میں بادشاہ کی تعریف کے علاوہ حقائق بیان کیے گئے ہوں۔

کسی بھی تاریخ کو مکمل طور پر سمجھنے کے لیے اس دور کے سماج اور اس کے ارتقائی سفر کو بغور جائزہ از حد ضروری ہے۔تاریخ اپنے اندر واقعات کا جمِ غفیر لیے ہوتی ہے۔اب اُن واقعات کی جانچ پڑتال اور اُن کے صحیح و غلط کا فرق واضح کرنے کے لیے زمانی حالات کو سمجھنا ضروری ہے۔جس کے لیے مختلف مورخین کی تحریر شدہ تواریخ کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔کیونکہ تاریخ سے اگاہی کا مقصد صرف اسلاف کے متعلق آگاہی نہیں بلکہ ماضی سے سبق حاصل کر کے حال کو بہتر کرنے اور مستقبل کو بہتر بنانے کی منصوبہ بندی کرنا ہے۔تاریخ کا علم انسانی معاشرے کے آغاز وارتقاء کا علم ہے۔تاریخ اس تغیر پذیری کو واضح کرتی ہے جا کا تعلق معاشرتی اقدار، مذہبی عقائد وغیرہ سے ہوتا ہے۔

تاریخ کا مطالعہ ہمیں شعور دیتا ہے مگر یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم نے اپنے ماضی سے کچھ سبق سیکھا یا نہیں؟ تو شاید ہم نے کچھ خاص افادہ حاصل نہیں کیا، کیونکہ افراد اور قوموں کا عمل انکے اپنے حالات کی پیداوار ہوتا ہے۔ وقت جس انداز سے حالات کو بدلتا ہے اس طرح گزشتہ سے پیوستہ رہنا مشکل ہوتا ہے ۔لیکن اس بات کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ تاریخ کا مطالعہ بے سود ہے کیونکہ کوئی بھی مسئلہ خود سے جنم نہیں لیتا بلکہ

اس کے پیچھے ایک مکمل تاریخی عمل ہوتا ہے جس کو سمجھنے کے لیے ہمیں ماضی کے کواڑوں کو کھولنا ہوتا ہے۔ جن مسائل کو بعض اوقات ہم فطرت کے کھاتے میں ڈال کر کھاتہ بند کرنے کی کوشش کرتے ہیں اگر بغور اُن کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کے یہ فطرتی نہیں بلکہ تاریخی عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔

تاریخ انسان کا مکمل ریکارڈ رکھتی ہے چاہے وہ تخلیقی ہو یا تخریبی معلوم تاریخ پتھر کے زمانے سے لیکر کر آج کل کے ٹیکنالوجی کے زمانے تک انسان کے تخلیقی عمل کا ریکارڈ رکھتی ہے یہ عمل معاشرے کو ایک جگہ ٹھہرنے نہیں دیتا بلکہ متحرک رکھتا ہے۔

تاریخی مطالعہ جہاں محبت کے جذبات کو پروان چڑھاتا ہے وہیں نفرت آمیز مواد کی بھی تاریخ میں کمی نہیں ہے۔ دنیا کی تاریخ میں ایک قوم کا ہیرو دوسری قوم کا قاتل ہوتا ہے مثلاً برصغیر کی تاریخ میں بھی ہندو مسلم فسادات کا ذکر بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے ہر ایک نے اپنے بہادروں کے واقعات کا بیان لوازمات سے کیا ہے اُس پر مستزاد یہ کہ اُس تاریخ کو نصاب کا حصہ بنا دیا گیا ہے جس کی وجہ سے نفرتوں نے دلوں پر ان مٹ نقوش چھوڑے ہیں۔

انسانی تاریخ کا زیادہ تر حصہ مسخ شدہ ہے جس کی بنیادی وجہ تاریخ کو سیاسی مفادات کے لئے استعمال کرنا ہے، یہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے کہ صاحبِ اقتدار اپنے سے پہلے مقتدر کے تاریخ نویسوں کے تاریخی دفاتر کے خاتمے پر ہی اکتفاء نہیں کرتے تھے بلکہ تاریخ نگاروں کو سزادی جانی یا قتل کرا دیا جانا ضروری سمجھا جاتا، اور اپنے منتخب شدہ تاریخ نویسوں سے اپنی من چاہی تاریخ لکھوائی جاتی تھی۔ ایک زمانے کے مخصوص وقت کو پُر آسائش کرنے کے لئے لاکھوں لوگوں کے سامنے حق و باطل، ظالم و مظلوم کو آپس میں خلط ملط کر دینا کوئی زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔ شاید انہی حقائق کی بنیاد پر ایک طبقہ تاریخ سے شغف کو لا حاصل قرار دیتا ہے۔ جب کہ ڈاکٹر مبارک علی رقمطراز ہیں:

> ''تاریخ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس سے شعور اور علم میں اضافہ ہوتا ہے، جس کی وجہ سے انسان میں تدبر اور معاملہ فہمی پیدا ہوتی ہے۔ تاریخ کے تجربے سے انسان سیکھتا ہے اور ماضی میں جو غلطیاں سرزد ہوئی ہوتی ہیں اُن سے اجتناب کرتا ہے، چونکہ تاریخ ماضی کے علم کو محفوظ رکھتی ہے اس لیے آنے والے اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اضافے کی کوشش کرتے ہیں''۔ ۲۸

یعنی تاریخ سیکھنے کے عمل کے ساتھ ساتھ بہتر انداز میں اخذ شدہ نتائج سے سبق حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ تاریخ کے واقعات کی وجوہات اور اس عہد کے عوامل کا ادراک ہی تاریخی شعور ہے۔ کیوں کہ جب مورخ

جب کسی واقعے کے اسباب پر تدبر و تفکر کر کے معلوم وجوہات سے اُس خاص عہد کے ثقافتی و تمدنی حالات کا جائزہ لیتا ہے تو اس کے پیچھے تاریخی شعور ہی کارفرما ہوتا ہے۔

علم التاریخ سے موجود علوم کے تقابلی مطالعے سے فکر و فہم کے نئے در وا ہوتے ہیں، تاریخ کا تقابل اگر فلسفے سے کیا جائے تو فلسفے کی پیچیدگیوں کو ختم کرنے میں تاریخ اپنا کردار ادا کر سکتی ہے، عمرانیات سے تقابل میں ہم فی زمانہ مسائل کو تاریخ کی غلطیوں سے سبق حاصل کر کے بطریق احسن سدھار سکتے ہیں۔ چونکہ تاریخ ریاستی و نظریاتی دباؤ میں لکھی جاتی ہے۔ لہٰذا شعوری طور پر ہمیں تمام امو کو سامنے رکھ کر ادراک کرنا ضروری ہے۔ تاریخی شعور کا جتنا رابطہ گزرے ہوئے کل کے ساتھ ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ رابطہ لمحہ موجود سے ہوتا ہے۔ کیونکہ گزشتہ زمانے کا تخلیقی عمل موجود زمانے میں تکمیل کو پہنچتا ہے۔ تاریخی شعور کی رسائی ہمہ وقت ماضی اور حال تک رہتی ہے۔ یہ بات تو طے ہے کہ جدید نظریات اپنی جگہ معاشرے میں تیزی سے بناتے ہیں جس کی وجہ سے پہلے سے موجود نظریات اپنا پہلے جیسا مقام برقرار نہیں رکھ سکتے کیونکہ جدید نظریات اپنے اندر زمانی تبدیلیوں کو سموئے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ تاریخی شعور کے متعلق ٹی ایس ایلیٹ کے الفاظ کو ڈاکٹر جمیل جالبی نے یوں ترجمہ کیا ہے:

> ''تاریخی شعور جس میں لا زمان اور زمان کا شعور الگ الگ اور ساتھ ساتھ شامل ہے، یہ وہ چیز ہے جو ادیب کو روایت کا پابند بناتا ہے اور یہی وہ شعور ہے جو کسی ادیب کو زمان میں اس کے اپنے مقام اور اپنی معاصرت کا شعور عطا کرتا ہے۔ کوئی شاعر، کوئی فنکار خواہ وہ کسی بھی فن سے تعلق رکھتا ہو، تن تنہا اپنی کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اس کی اہمیت اور اس کی بڑائی اسی میں مضمر ہے کہ وہ پچھلے شعراء اور فنکاروں سے اس کا کیا رشتہ ہے؟ الگ رکھ کر اس کی اہمیت متعین نہیں کی جا سکتہ۔ اسے پچھلے شعرا اور فنکاروں کے درمیان رکھ کر تقابل و تفاوت کرنا ہوگا''۔۲۹

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تاریخی شعور کے بغیر ماضی کی درست تفہیم نہیں ہو سکتی، اور حال کے مسائل کا ادراک بھی ممکن نہیں ہے، اور یہ بات یقینی ہے کہ ماضی اور حال کے صحیح جڑاؤ کے بغیر اچھے مستقبل کے خواب دیکھنا ناممکن بھی ہے اور لایعنی بھی ابن خلدون کے مطابق: ''ماضی مستقبل سے وہی مماثلت رکھتا ہے جو پانی کو پانی سے ہوتی ہے''۔۳۰، تاریخی شعور کے لئے کسی بھی زمانی واقعات و حالات کا علم لازمی ہوتا ہے کیونکہ ہر معاشرہ اپنی روایات کا امین ہوتا ہے اور اس کے ساتھ سماجی مماثلتوں سے بھی انکار ممکن نہیں،

سطح پر یکساں اظہار کرتا ہے اور درجہ بندی کا شکار نہیں ہونے دیتا، ڈاکٹر جمیل جالبی مزید وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ ''تاریخی شعور عوام و خواص کی تفریق مٹا کر نا انصافیوں کو دور اور سب کے لئے یکساں مواقع و مساوات کو مرکزِ فکر بنانے میں ہماری دست گیری کر سکتا ہے''۔۳۱ تاریخی شعور ماضی کی روایت کو مستقبل کی جدت سے ملانے کا راستہ ہے جس کی وجہ سے مستقبل میں ماضی کی تفہیم کی جاسکتی ہے۔ چونکہ ہم ایک روایتی معاشرے میں سانس لے رہے ہیں جہاں عادات، رسوم، ادب و دیگر بہت سی چیزیں سینہ بہ سینہ چلی آ رہی ہیں۔ جس کی وجہ سے روایت سے ہمارا تعلق مغربی دنیا کی نسبت زیادہ بھی ہے اور مضبوط بھی۔ بالخصوص شاعری میں روایت سے جدا رہ کر فن پارے کا تصور ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ شاعری کو روایت سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اس حوالے سے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے الفاظ کو ڈاکٹر جمیل جالبی نے یوں ترجمہ کیا ہے:

> ''کوئی شاعر، کوئی فن کار خواہ وہ کسی بھی فن سے تعلق رکھتا ہو، تن تنہا اپنی کوئی مکمل حیثیت نہیں رکھتا۔ اس کی اہمیت اور بڑائی اس میں مضمر ہے کہ پچھلے شعراء اور فنکاروں سے اس کا کیا رشتہ ہے؟ الگ رہ کر اس کی اہمیت متعین نہیں کی جاسکتی''۔۳۲

گویا کسی بھی دور کے ادیب کے ادب کو اس کے فن پارے کو پہلے سے موجود فن پاروں کے تناظر میں دیکھا اور جانچا جائے گا اور اس جانچ پڑتال میں جس شعوری کاوش کے ذریعے یہ عمل سرانجام دیا جائے گا اُسے تاریخی شعور کہتے ہیں۔ جس فن کار کا تاریخی شعور جس قدر بہتر ہوگا اُس کے فن پارے کی تفہیم اس قدر آسان ہو گی۔

کسی بھی فن پارے کو سب سے پہلے معاشرتی تناظر میں جانچنا چاہیے۔ تاکہ یہ بات معلوم ہو سکے کہ آیا معاشرے میں موجود رجحانات کا اظہار فن پارے میں موجود ہے یا نہیں؟ مثال کے طور پر آج کل کے معاشرے میں قتل و غارت گری، بے انصافی، دولت کی غیر مساویانہ تقسیم، طبقاتی کشمکش وغیرہ مسائل ہیں جنہوں نے معاشرے کو اپنے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے۔ جہاں ان مسائل کا تذکرہ ادیب کا حق ہے وہیں ان کے حل کی جانب اشارہ کرنا بھی اس کا فرضِ اولین ہے۔

تاریخی شعور و دیگر اصطلاحات گو کہ اُردو ادب میں مغربی ادب کے زیر اثر وارد ہوئی ہیں۔ لیکن اس کا ہر گز یہ مطلب نہیں کہ اس سے پہلے تاریخی شعور اُردو ادب کے ابتدائی یا کلاسیک دور میں ناپید تھا۔ ہمارے ادب کے کلاسیک شعراء میں تاریخی شعور موجود تھا لیکن اس کا واضح اظہار موجود نہیں تھا۔ کیونکہ کلاسیکی ادب کا زیادہ تر

حصہ غزل پر مشتمل ہے اور غزل کی زبان رمز و ایما کی زبان ہوتی ہے۔ جس کے اپنے تقاضوں کے مطابق اظہار کیا جاتا ہے۔ اس صنفِ سخن میں اظہار کا انداز بیرونی مشاہدات سے زیادہ اندرونی کیفیات پر ہے۔ غزل کے ابتدا میں ہمیں تصوف کا استعمال زیادہ ملتا ہے جس کی وجہ معاشرے پر اس کے اثرات کا ہونا ہے۔ بعد ازاں جوں جوں معاشرہ ارتقائی سفر طے کرتا رہا ویسے ہی مضامین میں تنوع آتا گیا۔ جس کا واضح فرق دبستانِ دہلی و لکھنو کی شاعری سے لگایا جا سکتا ہے۔ غزل کا اندرونی کیفیات سے خارجی مناظر کے مشاہدات تک کا سفر دبستان لکھنو کی مرہونِ منت ہے۔

غزل میں استعارات و تشبیہات بالواسطہ طور پر تاریخی و تہذیبی شعور کے عکاس ہوتے ہیں۔ جن کا اظہار آج کے زمانے میں بہت واضح انداز میں ہوتا ہے۔ فنکار ویسے بھی معاشرے کا حساس فرد ہوتا ہے۔ معاشرے میں موجود واقعات و مناظر کو ایک خاص تناظر میں دیکھتا ہے اور جب اندازِ نظر مختلف ہو تو اندازِ بیان بھی مختلف ہوتا ہے۔ سماج میں ہونے والی شکست و ریخت کا جائزہ موجود ادباء کی حال یا مستقبل میں آنے والی تخلیقات میں لازمی موجود ہوتا ہے۔ گو کہ بظاہر غزل کا علامتی نظام گُل و بُلبل، لب و رخسار، شمع و پروانہ رہے ہیں مگر جب معاشرہ انتشار کا شکار ہوا تو شعراء کے ہاں ہمیں سماجی ابتذال و سیاسی زوال پذیری کا بیان بھی ملتا ہے۔ کلاسیک شعراء کے ہاں 'شہر آشوب' جیسی صنف کا فروغ ہمیں تاریخی و تہذیبی شعور کی آگاہی کا پتہ دیتا ہے۔ جس میں ہمیں سماجی ناہمواریوں کا ذکر، تاراجیءِ شہر کا قصہ ملتا ہے جو اُس معاشرے کی صورتحال بھی ہے اور زمانی تاریخ بھی۔ شعراء کے ساتھ صوفیاء کرام جو خدمتِ خلق میں مصروف تھے اور اُن کی رسائی عام آدمی تک زیادہ تھی کے ابتدائی رسالوں اور فرمودات سے ہمیں سیاسی و سماجی معاملات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ معاشرہ کبھی بھی کسی ایسے ادیب سے خالی نہیں رہا جس کے ہاں ہمیں تاریخی تہذیبی شعور اور روح عصر مفقود نظر آئے کیوں کہ اگر ایسا ہو جائے تو حال جمود کی کیفیت کا شکار ہو جائے اور مستقبل کی جانب جست لگانے کے قابل نہ رہے۔ اُردو ادب میں دبستان لکھنو خارج کا نمائندہ تصور کیا جاتا ہے مگر اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ لکھنو کے ادباء نے اپنے معاشرے کی عیش و عشرت کی عکاسی کر کے وہاں کی رسوم و رواج کا ذکر کر کے اپنے معاشرے کو تاریخ کے اوراق میں زندہ رکھا۔ جس کی بدولت ہمیں اُس مخصوص دور کی صورتِ حال کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور اسی طرح دبستانِ دہلی کی شاعری میں ہمیں جہاں معاملہ بندی کا عنصر ملے گا وہیں زمانے کی ستم ظریفی، ناپائداری کا ذکر بھی ملے گا، دہلی کے اجڑنے کا حال، اس کے بعد کے حالات، اپنوں کا دُکھ معاشرتی انتشار وغیرہ ہمیں دہلی کی داخلی زندگی کے ساتھ خارجی حالات سے بھی آگاہی دیتے ہیں۔

فن کار کا فن پارہ مشاہدات کا مظہر ہوتا ہے اور مشاہدہ موجود سے اخذ شدہ نتائج کا نام ہے۔ ہر بڑا فن پارہ اپنے معاشرے کا آئینہ ہوتا ہے۔ میرؔ و سوداؔ کے زمانے میں اس کی مثال واضح انداز میں دیکھی جا سکتی ہے۔ کیونکہ معاشرہ میں افراد کی حالت ناگفتہ بہ تھی کسمپرسی کا عالم تھا۔ جس کا اظہار واضح انداز میں میرؔ کی غزل میں دیکھا جا سکتا ہے۔ جس دور میں غزل نے داخلی عوامل کے ساتھ خارجی عناصر کو بھی شاعری کا موضوع بنایا وہ زمانہ غالبؔ کا زمانہ ہے جس میں غزل کے اندر فلسفیانہ مباحث تک در آئی تھیں۔ غالبؔ تک آتے آتے ادب میں شعری و نثری لحاظ سے تاریخی و تہذیبی، سیاسی و سماجی شعور کی جڑیں پیوست ہو چکی تھیں۔ غالبؔ اپنے زمانے کو ایک شاعر، ماہر سماجیات، سیاسیات و ناقد کی حیثیت سے دیکھ رہے تھے۔ ناصر عباس نیر کہتے ہیں: ''گویا وہ ہند اسلامی تہذیب جو انیسویں صدی میں پنپ رہی تھی اس کے داخلی ناقد تھے۔ وہ اسی تہذیب کی کئی باتوں کو مسترد کرنے اور پھر اس کے اندر سے کئی نئے راستے تراشنے اور دریافت کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے''۔[۳۳] گویا غالبؔ اردو ادب میں تاریخی و تہذیبی، سیاسی و سماجی شعور کے واضح اظہار کا نام ہے۔ ہمیں نہ صرف غالب کی شاعری میں بلکہ ان کے خطوط میں بھی تاریخی، تہذیبی، معاشرتی شعور کی واضح نشانیاں ملتی ہیں۔ غالبؔ کے خطوط سے آج اکیسویں صدی میں بیٹھ کر انیسویں صدی کے معاشرے کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ دراصل ہر بڑا فن کار بغیر از معاشرہ اپنے فن پارے کی تخلیق نہیں کر سکتا۔ مذکورہ مباحث میں تاریخی شعور اور معاشرے میں اس کے اظہار اور انسان کے ساتھ اس کے تعلق کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاریخ انسان سے منسلک ہوتی ہے اور انسان تہذیب و ثقافت سے جُڑا ہوتا ہے۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ساتھ حال ماضی اور مستقبل حال میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں اس زمانی تغیر پذیری میں جو چیز ہمیں فرق سے آگاہ رکھتی ہے وہ تاریخی شعور ہے۔ تاریخ جس چیز کے ساتھ منسلک ہے وہ 'تہذیب' ہے۔

اب ہم تہذیب کی وضاحت کی کوشش کریں گے تا کہ تاریخ و تہذیب کے تعلق کو تعین ہو سکے، جس سے معاشرتی حقائق کو سمجھنے میں آسانی ملے گی۔ 'تہذیب، تاریخ اور انسانی زندگی کے ربط کو واضح کرنے سے پہلے یہ سمجھنا نہایت ضروری ہے کہ تہذیب ہے کیا اور اس سے مراد کیا ہے۔ تہذیب و ثقافت کی وضاحت الگ الگ نہیں ہے بلکہ تہذیب کی وضاحت ثقافت کی وضاحت بھی ہو گی اور یہی ثقافت کے ذیل میں آنے والی وضاحت کے حوالے سے بھی ہو گا۔ لہذا ہم سب سے پہلے کشاف تنقیدی اصطلاحات سے ثقافت کے مفہوم کو بیان کرتے ہیں (یہی تہذیب کا مفہوم بھی ہو گا)۔'' کرہ ارض پر بسنے والے انسانی گروہوں نے اپنی مادی اور روحانی ضروریات کو تسکین دینے اور ایک منظم اور مربوط معاشرتی زندگی بسر کرنے کے لیے کچھ نصب العین وضع کیے،

رہن سہن کے کچھ طریقے ایجاد کیے، کچھ عقائد اختیار کیے، کچھ ریتیں اور رسمیں بنائیں، کچھ قوانین وضع کیے، حلال وحرام کے درمیان کچھ امتیازات قائم کیے، کچھ نظریات وتصورات اور علوم وفنون سے دلچسپی لی۔ اسی طرح سماجی تعلقات کے تعاون سے (جو خود بھی اسی طرح وجود میں آئے تھے) ان اکتباسات نے ذیلی اختلافات کی گنجائش کے باوجود افراد معاشرہ میں تنظیم اور یکساں کردار پیدا کی۔ ان کی افادیت مسلم ٹھہری۔ چنانچہ اگلی نسل تک انہیں منتقل کرنا ضروری ہوا۔ نسلاً بعد نسل منتقل ہونے والے اکتباسات کے اس مجموعہ کو کلچر یا ثقافت کہتے ہیں''۔۳۴ اس وضاحت سے ثابت ہوتا ہے کہ ثقافت سے مُراد وہ تمام قوانین، نظریات، عقائد وغیرہ لیے گیے ہیں۔ جن پر عمل پیرا ہو کر انسان اپنی زندگی کو پرسکون انداز سے گزار سکتا ہے اور معاشرے میں اعلیٰ مقام پا سکتا ہے۔ سید سبطِ حسن تہذیب کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''تہذیب عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی کسی پودے کو کاٹنا، چھانٹنا، تراشنا تاکہ اس کی نئی شاخیں نکل سکیں اور نئی کونپلیں پھوٹ سکیں۔ فارسی میں بھی تہذیب کا لفظ کم وبیش انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اُردو میں تہذیب کا لفظ عام طور سے شائستگی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص تہذیب یافتہ ہے تو اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ اسکے اٹھنے، بیٹھنے، بات چیت کرنے، رہن سہن کا طریقہ ہماری اقدار کے مطابق ہے، وہ آدابِ مجلس کو بہت خوبی سے ادا کرتا ہے''۔۳۵

سبطِ حسن کی اس تعریف سے تہذیب کا معنی واضح ہوتا ہے کہ تہذیب انسانی معاشرے میں رائج قدروں کا نام ہے جن پر عمل پیرا ہو کر انسان اور دیگر مخلوقات میں واضح فرق محسوس کیا جا سکتا ہے۔ تہذیب پرانی قدروں کی بحالی کے ساتھ ساتھ اقدار میں خوشگوار تبدیلیوں کو خوش آمدید کہنے کا عمل ہے۔ تہذیب ہی وہ خشتِ اول ہے جس پر اخلاقیات کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ تہذیب انسانوں کو آپس میں مل جل کر رہنے کا درس دیتی ہے۔

کلچر میں معاشرے میں موجود ضروریات سے لے کر تصورات تک بحث کی جاتی ہے اور انہیں بعینہ زمانی ضرورتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے آنے والی نسل کو منتقل کیا جاتا ہے۔ ''تہذیب کسی گروہ کے عقائد کے تابع ہوتی ہے، ایسا اس لیے ہوا ہے کہ افراد کو گیروہ میں قائم رکھنے کے لیے کچھ مُشترک عوامل لازمی ہیں اور یہی عوامل ہی در اصل عقائد کا روپ دھارتے ہیں''۔۳۶ انسان فطرت کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے مگر بعض مواقع جبلت کو ترک کرنے سے فرد معاشرے پر اچھے اثرات مرتب کرتا ہے۔ تہذیب فرد میں گروہی احساس کو اجاگر کرتی ہے۔

بعض عمرانی ماہرین کے نزدیک صرف عادات و رسوم کا اجتماع ہی تہذیب میں دخیل نہیں ہوتا بلکہ تہذیبی روایت کے لیے صحت مند رسوم ہی تہذیب میں شمار کی جائیں گی ۔ ، تہذیب کے لئے مستعمل لفظ کلچر کی مزید وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے:

''کلچر میں لوگوں کے مخصوص گروہ کی طرف سے حاصل علم ، تجربہ ، عقائد ، اقدار رویوں ، معانی ، نظام ، دین ، تصوراتِ وقت و کائنات ، قوانین ، تعلقاتِ عامہ مادی اشیاء و دیگر تصورات انفرادی و اجتماعی طور پر آنے والی نسلوں کے درمیان منتقل کرنے کا نام ہے''۔ ۳۷

تہذیب جہاں انسان کے ظاہری اعمال و افعال کے متعلق بحث کرتی ہے وہیں باطنی آداب و رسوم ، تصورات و خیالات کو لے کر بھی بحث کرتی ہے ، تہذیب انسانی زندگی کے متعلق خواہ وہ داخلی ہوں یا خارجی ذہنی ہوں یا مادی افعال و خیالات کا احاطہ کرتی ہے ۔ تہذیب ایک ایسی معاشرتی اکائی ہے جو مذہب سے لے کر اخلاقیات ، معاملات ، ہر وہ فعل کہ جس کا انسان بصورتِ فرد یا گروہ مرتکب ہوتا ہے کا احاطہ کرتی ہے ۔ تہذیب انسان کو شائستگی و وسیع المشربی کا درس دیتی ہے اور تعصب سے بھرپور ذہن کی نفی کرتی ہے ۔ تہذیب معاشرے میں موجود ہر ذہن اور اس سطح پر موجود ہر تصور کا نام ہے ۔ انسان اور حیوان میں میں بنیادی فرق تہذیبی عناصر ہیں کیوں کہ انسان اپنی فطرت کی وجہ سے اجتماعی ماحول پیدا کرنا انسان کے لیے لازمی ہے اور اجتماعی زندگی میں موجود سوسائٹی سے تعلقات کی وسعت اور معنوی تنظیم انسانی شعور کی گہرائی پر اثر انداز ہوتی ہے ۔ یہ بات مسلم ہے کہ بغیر از ااجتماع انسانی زندگی کی تکمیل اور انسانی جوہر ذات کا اظہار نہیں ہوسکتا ۔ بقولِ اقبال

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

تہذیب کی مزید وضاحت ہمیں سرسید احمد خان سے ملتی ہے جو معاشرے کے لیے تہذیب کو ناگزیر وصف قرار دیتے ہیں:

''جب ایک گروہِ انسانی کسی جگہ اکٹھا ہو کر بستا ہے تو اکثر ان کی ضرورتیں اور ان کی حاجتیں ، ان کی غذائیں ، ان کی پوشاکیں ، ان کی معلومات اور ان کے خیالات ، ان کی مشترک باتیں اور ان کی نفرت کی چیزیں ، سب یکساں ہوتی ہیں ، اور اسی لیے بُرائی اور اچھائی کے خیالات بھی یکساں ہوتے ہیں ، اور بُرائی کو اچھائی میں تبدیل کرنے کی خواہش سب میں ایک جیسی ہوتی ہے اور

یہی مجموعی خواہش تبادلہ اس قوم یا گروہ کی سویلائزیشن (تہذیب) ہے''۔ ۳۸

ایک امر واضح ہے کہ تہذیب انسان کے لیے ضروری ہے اور انسان تہذیب کے لیے کسی ایک کی عدم موجودگی میں معاشرہ تشکیل نہیں پا سکتا۔ انسان کو معاشرتی حیوان کہا گیا ہے اور ایک چیز ہی انسان اور دوسری مخلوقات میں تفاوت کا باعث ہے اور وہ تہذیب ہے۔ انسان نے گروہی زندگی سے بہت کچھ حاصل کیا ہے، انسان نے غذائی ضروریات پوری کرنے کے لیے پتوں سے لے کر زراعت تک کا سفر پلک جھپکنے میں طے نہیں کیا بلکہ اس کے لیے معاشرتی، تہذیبی ارتقائی عمل سے گزر کر ہی یہ مقام پایا ہے۔ بالکل یہی صورتحال جسم کی ڈھانپنے کے حوالے سے ہے۔ برہنگی سے لباس تک کا سفر تہذیب کے ارتقاء کا پتا دیتا ہے۔ انسان نے تہذیبی ارتقاء کو بروئے کار لاتے ہوئے زبان استعمال کی جس سے شعوری انقلاب برپا ہوا۔ ایک دوسرے کو بات سمجھانے کے ساتھ مسائل سمجھنے اور ان کو حل کرنے کے عمل کا آغاز ہوا۔ زبان نے انسان کو ہر لمحہ تخلیقی مراحل سے گزرنے میں آسانی فراہم کی۔ زبان اپنی زمانی کیفیت کو دوسروں تک پہچانے میں مدد دیتی ہے۔ آج کل کے دور میں ہم زبان کے بغیر معاشرے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ زبان سے ہی ایجادات کا عمل وجود میں آیا نیز بہتر سے بہترین تک کا سفر بھی زبان کی مرہونِ منت ہے۔ کیونکہ خیالات کا انعکاس ہی نئے خیالات کے لیے راستہ ہموار کرتا ہے۔ جس سے مشاورت وجود میں آتی ہے اور تبدیلی یا بہتری کا عمل بغیر از مشاورت ممکن ہی نہیں کیونکہ مشاورت ہی سوچ کے نئے در وا کرتی ہے۔

باہمی ربط سے افرادِ معاشرہ نے جو قوانین بنائے اور اُن پر عمل پیرا ہوئے اور جن ضروریات کو اپنی اور معاشرے کی فلاح کے لیے پر امن طریقے سے مکمل کرنے کے لیے جو قائدے بنائے گئے دراصل یہی ان کے تہذیبی شعور کے آئینہ دار تھے۔ تہذیب کا بنیادی تعلق معاشرے کے خارجی مظاہر سے ہوتا ہے۔ جس میں انسان کے روز مرہ کے افعال و اعمال اور اعلیٰ اخلاق شامل ہوتے ہیں۔ تہذیب فطرت کے تقاضوں سے موافقت رکھتی ہے۔ غیر فطری عناصر کا تہذیب میں کوئی مقام نہیں ہے۔ فرد اپنی تہذیب کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اس کی عادات، لباس، زبان سے اس کی تہذیب کا پتہ چلتا ہے۔ جہاں عادات و اطوار سے تہذیب واضح ہوتی ہے وہیں تخلیق و تعمیر سے بھی تہذیب کا پتہ ملتا ہے۔ قدیم تہذیبوں سے ہماری ملاقات زمانی نہیں بلکہ تخلیق و تعمیر کے ذریعے ہوئی۔ فردوسی کے شاہنامہ سے شاہ جہاں کے تاج محل تک اور ارسطو کی بوطیقا سے اہرام مصر تک سب ہمارے تہذیبی ورثے ہیں۔ جو ایک مخصوص دور کے افراد، ان کے اردگرد کے ماحول، اُس ماحول کے غالب رجحانات کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ یہ تمام نشانات تاریخی عمل سے گزر کر ہم تک پہنچے ہیں۔ اب ہمارا یہ اخلاقی و تہذیبی

TH-2155

فریضہ بنتا ہے کہ ان کی حفاظت کریں اور آنے والی نسلوں تک پہنچائیں ۔تا کہ وہ بھی اس ورثے سے آگاہ ہو سکیں ۔ انہی تہذیبی و ثقافتی ورثوں کی شناخت ، حفاظت اور اس کے ساتھ موجود عوامل کو جدید وقت کی ضرورتوں سے ہم آہنگ کرنا ہی تہذیبی شعور کہلاتا ہے ۔

ادب اور تہذیب کا تعلق بہت گہرا ہے۔ اس تعلق میں تخیل سے تخلیق تک کی وضاحت موجود ہے ۔ کیوں کہ جس انداز سے ثقافت انسانی زندگی پر اپنے اثرات مرتب کرتی ہے عین اُسی طرح ادب بھی انسانی زندگی پر ان مٹ نقوش مرتب کرتا ہے ۔لیکن ایک بنیادی فرق دونوں میں یہ ہے کہ چونکہ ثقافتی دائرہ کار ادبی دائرے سے وسیع ہوتا ہے، لہذا اثرات کی نوعیت بھی ویسے ہی ہوتی ہے ۔لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ادب کے اثرات نہ ہونے کے برابر ہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر انسان اقدار کی پاسداری و منتقلی کے سلسلے کے حوالے سے ثقافت سے جُڑا ہوتا ہے جب کہ ادب مخصوص ذہنوں کے لیے ہوتا ہے ۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے اس قضیے کو آسانی سے حل کیا ہے کہتے ہیں :اگر یہ کہا جائے کہ انسانی زندگی کا کُل ثقافت ہے اور ادب اس 'کُل ' کا 'جُز' تو زیادہ غلط نہ ہوگا ۔ ۳۹؎

ہر معاشرے کا ادب جہاں اس کے معاشرے کی عکاسی کرتا ہے وہیں تہذیب کو بھی سموئے ہوئے ہوتا ہے ۔ ہر دور کے ادب میں اس زمانے کی تہذیبی تاریخ موجود ہوتی ہے ۔ ہر قوم کی تہذیبی خصوصیات جس انداز سے الگ الگ ہیں ویسے ہی ان کا ادب بھی الگ الگ خصوصیات کا حامل ہے ۔مثال کے طور پر اُردو ادب میں 'ریختی' جیسی صنف کا ہونا ایک مخصوص دور کے معاشرے ، تہذیب ، نظریات ، رجحانات کو واضح کرتا ہے ۔ اس کے ساتھ لوک گیت ، داستانیں ، رقص وغیرہ کا جائزہ لیا جائے تو یہ اپنے تہذیبی دائرے سے باہر نہیں ملیں گے ۔ تہذیبی شعور تاریخی شعور سے کسی طور جدا نہیں ہے ۔دونوں معاشرے کے مندرجات کے حوالے سے بحث کرتے ہیں ۔تہذیبی شعور سے کنارہ کش ہو کر ہم قطعاً معاشرے کی فعالیت ، لوگوں کے رویوں ، رجحانات کا اندازہ نہیں لگا سکتے ۔ ہر شخص کسی نہ کسی حوالی سے اپنی تہذیب کا عکاس ہوتا ہے اور وہ اپنی تہذیب کا اظہاریہ ہوتا ہے ، ہر فرد کا اپنے افعال میں تہذیب کا اظہار ہی اسکا انفرادی تہذیبی شعور ہے مثلاً اگر ایک فرد مذہبی ماحول میں پروان چڑھا ہے تو افعال و اعمال سے مذہب کی جھلک نمایاں ہوگی ۔ بالکل اسی طرح اگر کوئی ادبی ماحول میں پروان چڑھا ہو تو ادب کے معاملے میں مذکورہ شخص کی گہرائی و گیرائی ، ادب شناسی ، آگہی دوسرے افرادِ معاشرہ کی نسبت زیادہ ہوگی ۔یعنی اپنے تہذیبی ورثے کا کُھل کر اظہار بھی تہذیبی شعور کا خاص جُز ہے ۔

تہذیبی عناصر کی آبیاری ادب سے ہوتی ہے ۔جس سے بعد میں آنے والے لوگ اپنے قدماء کے ذہنی

وفکری ارتقاء کا جائزہ بخوبی لے سکتے ہیں ۔ ہر تہذیب جس طرح افراد کو مخصوص طرزِ زندگی بخشتی ہے، اسکا ادب اس معاشرے میں موجود رویوں، رجحانوں کا آئینہ ہوتا ہے ۔ ادب کو عصری تقاضوں کے متعلق تبدیل کرنے میں تہذیبی عوامل کا عمل دخل ہوتا ہے ۔ یہ بات بھی واضح ہے کہ اگر کوئی تہذیب عصری رجحانات کو قبول نہیں کرے گی ماضی کی دیوار کا نوشتہ بن جائے گی ۔ کیوں کہ غالب عصری رجحانات ہی اس مخصوص عصر کی روح کہلاتے ہیں ۔ جن کو قبول کرنا نہایت ضروری ہے ۔

(د) روحِ عصر:

معاشروں میں موجود رویوں میں ایک ایسی فکر ہوتی ہے جس کے اثرات دور رس ہوتے ہیں ۔ اس کی بازگشت زمانوں پر محیط ہوتی ہے ۔ جس کی وجہ اُس مخصوص زمانے میں اس فکری نظام کا قبولِ عام ہوتا ہے ۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایسا عمومی رویہ جسے فی زمانہ اکثریت نے قابلِ اتباع سمجھا ہو اور فکر سے عمل تک اس کا اظہار کیا ہو اسے 'روحِ عصر' کہتے ہیں ۔ کشاف تنقیدی اصطلاحات میں اس کی وضاحت ان الفاظ میں ہے :

> ''ZEITGEIST جرمن لفظ ہے جو ZEIT (وقت) اور GEIST (روح) سے مرکب ہے اردو میں اس کا ترجمہ 'روحِ عصر' کیا جاتا ہے ۔ روح عصر فلسفہ تاریخ کی اصطلاح ہے ۔ اس سے مُراد کسی دور کا وہ غالب رجحان جو اس دور یا نسل کے سیاسی نظریات، سماجی روابط، اخلاقی عقائد، معاشی تصورات، علمی سرگرمیوں اور ادبی تخلیقات میں ایک موثر عامل کے طور پر سرایت کر جاتا ہے اور باشعور لوگ زندگی کے ہر شعبے میں اس کے موثرات کا سراغ لگا سکتے ہیں''۔[۴۰]

یعنی ایسا رجحان یا رویہ جو انسانی زندگی کی تمام اقدار سے متعلق اور نمایاں ہو اور ہر صاحبِ ذی شعور کی زندگی پر اس کے اثرات نمایاں ہوں روح عصر کہلائے گی ۔ چونکہ ہمارا موضوع ادبی حوالے سے ہے لہذا یہاں روحِ عصر کو ادبی پس منظر میں دیکھنے کی سعی کی جائے گی ۔

معاشرے کا باشعور طبقہ بلواسطہ یا بلا واسطہ روحِ عصر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ روح عصر کا اظہار اس کی سرگرمیوں سے تخلیق میں منقلب ہوتا ہے ۔ ادب میں کسی زمانے کی روح کو محسوس کیا جا سکتا ہے کیونکہ ادب ہی ایسا لطیف اظہار یہ ہے جو بہتر اور وسیع انداز سے معاشرے پر اثر انداز ہوتا ہے ۔ وکی پیڈیا پر 'روحِ عصر' کی وضاحت کچھ یوں ملتی ہے :

> ''اس کا مطلب وقت کی روح ہے اور عموماً اس اصطلاح کی نسبت ایک مشہور

فلسفی جارج ہیگل کی طرف دی جاتی ہے لیکن اس نے کبھی اس اصطلاح کو استعمال ہی نہیں کیا ، البتہ تصانیف سے ایک جملہ ملتا ہے der geist (seinerzeit) جس کا مطلب اپنے دور کی روح کے ہیں کو استعمال کیا ہے ،کوئی شخص اپنے زمانے سے آگے نہیں نکل سکتا کیونکہ اس دور کی روح اس کی اپنی روح ہوتی ہے''۔۴۱

روحِ عصر مکمل زمانے کو اپنے حصار میں رکھتی ہے اور پر رویہ، رجحان ،تخلیق اسی کے زیر اثر ہوتی ہے 'روحِ عصر' ہی ہمارے فکری سرمایے کی ضامن ہوتی ہے ۔ پروفیسر انور جمال روحِ عصر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'' اگرچہ زندگی کی کچھ اقدار ایسی ہیں جو بلا امتیاز تمام وقتوں اور سطحوں پر حکومت کرتی ہیں ۔لیکن انہی سرچشموں سے کچھ ایسے مخصوص نظام و دائرے بھی وجود میں آتے ہیں جو اپنی الگ شناخت کے مقتضی ہوتے ہیں ۔خیال کیا جاتا ہے کہ ہر زمانے اور عہد کی اپنی روح ہوتی ہے۔ جسے سمجھے بغیر فن میں تازہ کاری کا وصف پیدا نہیں ہوتا ۔انسان کے لیے کیا کچھ اہم ہے اس راز کو پانے کے لیے زمانے کی کروٹ کا تصور لازمی حیثیت رکھتا ہے''۔۴۲

گویا روحِ عصر انسانی زندگی میں موجود اقدار کا ایسا نمایاں دائرہ یا نظام ہے جو اس دائرے میں موجود باقی اقدار کے مقابلے میں نمایاں ہوتا ہے ۔مزکورہ بالا وضاحت میں ایک اور چیز اہم ہے کہ ہر عہد میں یہ نظام تبدیل ہوسکتا ہے لازم نہیں کہ ایک مخصوص دور کی روحِ باقی زمانوں کو بھی اپنے حصار میں لے لے۔فن کار جس انداز سے نظام کو دیکھتا ہے وہ انداز مخصوص سمت کا تعین کرتا ہے ۔اسی وجہ سے اقدار کے برتاؤ میں تخلیق کار اور دوسرے افراد کے درمیان ہمیشہ سے ایک واضح فرق رہا ہے ۔فنکار زمانے کی اقدار کو تبدیل بھی کرتا ہے اور قائم بھی کرتا ہے ۔وہ اپنے فکری نظام پر معاشرے کے اقدار کو لانا چاہتا ہے فن پارے میں جدت تخیل دراصل فنکار کی تخیلانہ پرواز ہی ہے جو ہر قاری اپنے اپنے انداز سے محسوس کرتا ہے ، روحِ عصر کا تعین ہی فن کار کے فکری نظام کی تفہیم کی جانب پہلا قدم ہوتا ہے ۔آج کل کا معاشرہ مثلث کے گرد مصروف ہے جس میں موجود افراد مذہب ، فلسفہ، سائنس کے گرد ہی نظام میں منقسم ہیں یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ مذہب ، فلسفہ اور سائنس کا بنیادی موضوع انسان اور کائنات ہی ہے ۔مذہب کائنات اور انسانی معاشرے میں اخلاقیات پر زور دیتی ہے ۔ سائنس ایسا عقلی نظام ہے جس میں کائنات اور انسان کو مخصوص اور متعین عقلی تجربوں پر پرکھنے کے بعد حتمی فیصلہ

صادر کیا جاتا ہے اور فلسفہ اپنی تمام تر پیچیدگیوں کے باوجود مذہب اور سائنس کے جزیتاً مباحث کو اپنے موجود مباحث سے تقابل کے بعد نتائج اخذ کرنے کا نظام ہے۔ روح کا تعلق بھی مذکورہ بالا ہر نظام سے موجود رہتا ہے۔

علی عباس جلالپوری نے اپنی کتاب ''روحِ عصر'' میں ادوار اور ان کی روحوں کے متعلق ایک جدول قائم کیا ہے جس سے ہر زمانے کی عصری روح کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

نمبر شمار	تاریخی دور	روح عصر
۱	ماقبل تاریخ	قدیم انسانوں کا سورج، چاند، تاروں، درختوں، جانوروں کو اپنے آپ پر قیاس کر کے ان سے روحیں منسوب کرنا۔
۲	زرعی انقلاب کا دور	مسلکِ زرخیزی (FERTILITY CULT) اس دور کے زرعی تمدنوں کے مذہب اخلاق، فنون لطیفہ، وغیرہ میں زرخیزی کے خیال کو بنیادی اہمیت کا حاصل ہونا۔
۳	ارتقائے تمدن قدیم تمدنِ یونانی	مسالکِ زرخیزی کی اصطلاح (چھٹی صدی قبل مسیح کی ایک عالمگیر تحریک)۔
۴	تمدنِ روم	کلاسیکی نظریہ حیات (عقل وخرد کی فوقیت جذبہ و جبلت پر) ۔
۵	ازمنہ وسطیٰ	عالمی شہرت کا تصور (رواقیین کا تاریخِ عالم میں پہلی بار مدلل انداز میں انسانی
۶	نشاۃ الثانیہ	برادری کا تصور پیش کرنا۔
۷	صنعتی انقلاب، دورِ حاضر	علم کلام (اہلِ مذہب کا فلسفہ کو مذہب کی کنیز قرار دینا)۔
۸		آزادیٔ فکر ونظر (کلاسیکی علوم کا احیاء، سائنس کی ترقی، عقلِ انسانی کا علم کلام کے تصرف سے نجات پانا)۔
		سائنٹیفک طرزِ تحقیق (حقیقت پسندی کے زاویہء نگاہ کی تشکیل)۔۴۳

اوپر دیے گئے گراف میں دیکھا جا سکتا ہے کہ وقت کی تبدیلی کے ساتھ روح عصر میں بھی تبدیلی واقع ہوئی ہے ،زمانی تغیر پذیری کا عمل روحِ عصر پر بھی اثرات مرتب کرتا ہے۔

ہر زمانہ اپنا اپنا الگ عصری رجحان لیے ہوئے ہوتا ہے یہ بھی ممکن ہے کہ ایک وقت میں اقدار کے نہاں خانوں میں مختلف عصری رجحانات پرورش پا رہے ہوں لیکن غالب رجحان ہی عصری روح کے منصب پر فائز ہوتا ہے۔ رجحان اکثریت کا شعوری راستہ ہے جو اقلیت کو راغب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ بات ارتقاء زمانہ سے ثابت ہے اور ممکن ہے کہ ایک دور کا غالب عصری رجحان دوسرے دور کا مغلوب رجحان ہو۔

فن پارہ جہاں ادبی رجحانات کو اپنے اندر سموئے ہوتا ہے وہیں پر، معاشرتی رویے بھی اس پر بھرپور اثر

انداز ہوتے ہیں ، لہٰذا کوئی بھی ایسی تخلیق جو قاری کے فکری رجحان اور جمالیاتی ذوق کو بیک وقت اپنی جانب متوجہ کرے تو اس تخلیق کے خمیر میں روحِ عصر موجود ہوتی ہے ۔ادب کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو موجود قدیم ادبی مثالیں اپنے اندر عصری روح لیے ہوئے ہیں۔ جس کی وجہ سے ہمیں اس دور کو چشمِ تخیل سے دیکھنے میں مدد ملتی ہے ، قدیم یونانی ادب میں اوڈیسی ، عربی ادب میں سبعہ معلقہ ، داستان الف لیلہ، فارسی میں مثنوی معنوی سے لیکر شاہنامہ فردوسی ، اور اردو ادب کے اساطیری دور میں داستانِ امیر حمزہ وغیرہ سے میرؔ و غالبؔ کی تخلیقات میں روحِ عصر بدرجہ اتم موجود ہے۔ عابد حسن منٹو ادب کی تخلیق میں روحِ عصر کے اثرات کے متعلق کہتے ہیں :

> ''ہر شعری روایت اور ہر ادبی معیار کی بنیاد ایک طرف تو اس فکری میلان پر ہوتی ہے جس سے اس کا خمیر اُٹھتا ہے اور دوسری طرف اس طریقِ ابلاغ و اظہار پر جو اس کو فنی پیکر میں ڈھالنے کا کام کرتا ہے''۔۴۴

غزل کی تنگ دامنی اور زمانی رجحانات کی وسعت کا نتیجہ نظم کی مقبولیت کی صورت میں ہمارے سامنے آیا ، حالیؔ کا نظم کی طرف جھکاو اور بعد ازاں انجمنِ پنجاب کے مشاعروں میں نظم کا بیان معاشرتی تقاضوں ، رویوں اور رجحانات کے عین مطابق تھا۔ فن پارہ جہاں روحِ عصر کا متقاضی ہوتا ہے اسکے ساتھ فن کار سے فنی لوازمات کا بھی تقاضا کرتا ہے کیونکہ فن پارہ کی تکمیل کے لیے فنی عوامل کا ہونا ناگزیر ہے لیکن بعض اوقات فنی پیچیدگیاں فن کار کو اس درجہ اپنے حصار میں لے لیتی ہیں جس سے ادب کی مقصدیت پسِ منظر میں جانے کا خدشہ ہوتا ہے لہٰذا فن کار کو ادبی مقاصد اور فنی لوازمات کے بین بین رہنا پڑتا ہے ۔فن اور فنکار کے مابین تعلق کو ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے :

> ''ادیب اگر'' دیدہ بینائے قوم'' ہے تو اسے محض عصر کی خارجی صورت تک محدود ہو کر نہیں رہنا ہوگا بلکہ اس کے عقب میں جا کر عصر کی روح یا جوہر سے بھی متعارف ہونا ہوگا ، عصر کا یہ جوہر ثقافتی کروٹوں کے علاوہ مختلف علوم میں ہونے والی پیش رفت سے بھی مرتب ہوتا ہے ، لہٰذا علم سے جو روشنی برآمد ہوتی ہے وہ عصر کے اعماق میں جمع ہوتی ہے مگر ایک شخص جو اپنے زمانے کی بالائی سطح پر رہا ہو ، اسے تو شاید اس روشنی کی خبر بھی نہ ملے ۔صرف ایک فنکار ہی اپنے تخلیقی عمل کی مدد سے اس روشنی تک رسائی پاتا اور پھر پرومیتھیس طرح اس روشنی سے ایک کرن چرا لاتا ہے ، اس زاویے سے دیکھیں تو عصر کی بالائی سطح پر جو روشنی پھیلتی ہے وہ از خود عصر کے شگافوں سے برآمد نہیں ہوتی بلکہ

تخلیق کاروں کی وساطت سے ایسا ممکن ہوتا ہے''۔۴۵

گویا ادب معاشرے اور فرد کے درمیاں آگاہی کا راستہ ہے، مگر یہ راستہ تفریح طبع یا مسرت کا نہیں بلکہ اعلیٰ سطح پر پیغام، رہنمائی، معاشرت، اور کائنات و انسان کی تفہیم کا راستہ و ذریعہ ہے۔ مقاصدِ ادب کا اظہار لطیف پیرائے میں قاری کو تفکر و تدبر کی دعوت دیتا ہے ایک ادبی تخلیق بنیادی طور پر فکر اور تہذیب دونوں کے ساتھ برابر رشتہ قائم کیے ہوتی ہے اور جس قدر اس میں فکری جمالیات کا عنصر نمایاں ہوگا عین اسی طرح تہذیبی عناصر کی نمائندگی بھی ضرور ہوگی، ادیب کے لیے نظریہ کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں کیونکہ نظریہ ہی ادیب میں تحرک کا باعث ہوتا ہے اور نظریہ کا اظہار گویا ادیب کا مافی الضمیر ہے جو تخلیق کی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے ۔ ایک تخلیق کار ہمہ وقت تخیل اور جذبے کے بین بین سفر کرتا ہے وہ اپنے تخیل کے ذریعے جذبات کا بیان کرتا ہے اور اپنے باطن کو سکون فراہم کرتا ہے اسی حوالے سے ہادی حسین نے ولیم ورڈز ورتھ کے الفاظ کو یوں ترجمہ کیا ہے:

> ''(تخلیق کار) ایک انسان ہوتا ہے جو دوسرے انسانوں سے خطاب کرتا ہے ،یہ بجا ہے کہ وہ ایک ایسا انسان ہوتا ہے جسے عام انسانوں سے زیادہ حسیت ،گرم جوشی اور نرم طبع ودیعت ہوئی ہوتی ہے ،ایک ایسا انسان جسے اپنے جذبوں اور ارادوں سے دوسرے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ دلچسپی ہوتی ہے ،جو دوسریلوگوں کے مقابلے میں اس روح زندگی سے جو ہر انسان کے اندر مضمر ہوتی ہے زیادہ لذت اندوز ہوتا ہے ۔ہمارے احساسات اہم موضوعوں سے متعلق ہو جاتے ہیں ،تا کہ اگر ہم میں حسیت کی مناسب مقدار ہوتو ہم میں ایسی ذہنی عادتیں راسخ ہو جاتی ہیں کہ ہم اُن عادتوں کے احکام کی اندھادھند تعمیل سے ایسی ایسی چیزیں اور ایسے ایسے جذبات کو اور انکے باہمی روابط کو بیان کرنے لگتے ہیں کہ اُن سے پڑھنے والے کے ذہن میں روشنی کا پیدا ہونا اور اس کے جذبات کی تقویت لازمی ہے''۔۴۶

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تخلیق کار کا موجود نظریوں سے منسلک ہونا ادیب کی فکری تنظیم کا باعث بنتا ہے۔ کیونکہ فن پارہ کسی نہ کسی موجود رویوں، اور رجحانوں کا اظہار ہوتا ہے اور وہی ادیب کا ذاتی موقف ہوتا ہے کیوں کہ ادیب اپنی بصیرت کے ذریعے معاشرے میں تبدیلی کا خواہاں ہوتا ہے ۔تخلیق کار ایک مخصوص تخلیقی عمل سے گزرتا ہے جس میں اس کے جذبات، احساسات، قلبی کیفیات یعنی داخلی ماحول

میں غوطہ زن ہو کر وہ جب باہر آتا ہے تو ایک مخصوص کیفیت میں استخراج کیفیت سے گزر کر اس کو منتقل کرتا ہے اب اگلے مرحلے میں یہ ذمہ داری اس کی اپنی بنتی ہے کہ وہ خیال کو الفاظ کا پہناوا کس انداز سے پہناتا ہے آیا وہ عوامی ذہنی سطح کو پہنچا ہے یا نہیں؟ آیا اس کی تحریر صرف مخصوص طبقے کی تحریر ہے یا ہر فرد کی تحریر؟ ڈاکٹر وزیر آغا اس حوالے سے کہتے ہیں:

> ''ایک اچھے ادیب کا یہ کام ہے کہ وہ اپنے تخلیقی عمل میں پہلے تو لفظ کو اس کے مروجہ مفہوم سے نجات دلاتا ہے اور پھر ایک جادوگر کی طرح نئے، تازہ اور زرخیز مفہوم سے منسلک کر دیتا ہے۔ مگر یہ مفہوم کوئی پہلے سے طے شدہ نظریہ یا منطقی خیال نہیں ہوتا بلکہ ایک پرچھائی کی مانند ہوتا ہے جو لحظہ بہ لحظہ بڑی ہوتی چلی جاتی ہے اور اَن دیکھے اَن چھوئے جہانوں کو صورت پذیر کرتی ہے۔ (اس) سطح پر انسانی شعور کا کام اشیاء کو نام زد کرنا اور تعقلات قائم کرنا ہے۔ چنانچہ اسے ایسے الفاظ کی ضرورت ہے جن میں کوئی ابہام نہ ہو، جن کے معانی متعین اور جہت واضح ہو، تاکہ ابلاغ و ترسیل کا وہ مقصد پورا ہو سکے جو نارمل شریفانہ زندگی بسر کرنے کے لیے ناگزیر ہے مگر شعور کی اس کاروباری سطح کے نیچے ایک اور جہان بھی ہے جس کی اشیاء کو آپ ایک عمومی سا نام تو دے سکتے ہیں مگر جنہیں آپ تعقلات میں ڈھال نہیں سکتے، مثلاً خوشی، غم، برہمی ایسے مجرد محسوسات جن کی نشان دہی کے لیے آپ ان کے گرد موہوم سے خطوط ہی کھینچ سکتے ہیں۔ مگر آگاہی کی اس سطح کے نیچے ایک اور دیار بھی ہے جس کو آپ پہچان تک نہیں سکتے۔ فنکار کا کام یہ ہے کہ وہ شعور کی سطح سے نیچے اُتر کر آگاہی کی اس زیریں سطح تک رسائی حاصل کرے جس میں پوری کائنات کا تخلیقی لاوا موج زن ہے۔۔۔۔ چنانچہ اعلیٰ فنکار کاروباری لفظ کے چھلکے کو توڑ کر اس کے اندر کے مغز کو گرفت میں لیتا ہے اور پھر اسے یوں منقلب کرتا ہے کہ وہ ذات کی تہوں میں چھپے ہوئے احساس تک پہنچے اور اسے منظر عام پر لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے''۔ [۴۷]

مذکورہ بالا طویل اقتباس 'تخلیق' کے خیال سے تحریر تک کے عمل کو واضح کرتا ہے۔ فن کار اسی لیے معاشرے کی آواز ہوتا ہے کہ جس انداز سے وہ شعور کی تہ دار پرتوں کو الٹ کر پہلے خیال کو ابھارتا ہے بعد ازاں

اسی خیال کو الفاظ دینے کے لیے جس کیفیت سے گزرتا ہے وہ سب سے اہم صورت اختیار کر جاتی ہے، اور یہی چیز اسے دیگر افرادِ معاشرہ سے ممتاز کرتی ہے۔

(ھ) اُردو غزل اور عصری حسیت؛ ایک محاکمہ:

اُردو شاعری کی تاریخ اگر پہلے صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ سے مدِ نظر رکھی جائے تو کم و بیش چار صدیوں پر محیط ہے اور امیر خسرو کے زمانے کو بھی اگر ذہن مین رکھا جائے تو چھ سو سے سات سو سال تک کی تاریخ ہمارے سامنے آتی ہے۔ جس میں ہمیں ہر اس دور کی نمائندگی ملتی ہے جس میں ادباء و مفکرین نے اپنے اپنے نظریات کے ذریعے مخصوص زمانوں کو متاثر کیا۔ ۱۷۰۷ء میں عالمگیر کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت جس تیزی سے زوال کی کھائی میں گری اس کے بیان کی ضرورت یہاں نہیں ہے۔ لیکن یہ بات واضح ہے کہ ابتداء سے ہی اردو شاعری میں زمانے کے تلخیوں کا ذکر ملتا ہے۔

اُردو غزل کی مسلسل ادبی تاریخ کا آغاز دکن سے ہوتا ہے۔ بہمنی سلطنت کی ایک سو بہتر سالہ حکومت کے بعد ریاست جب پانچ حصوں میں تقسیم ہوئی تو گولکنڈہ اور بیجا پور کی ریاستیں ادبی حوالے سے بہت نمایاں رہیں۔ جس کی وجہ اس کے سلاطین کی ادبی وسعت نظری و دلچسپی تھی۔ اس دور کا آغاز سلطان محمد قلی قطب شاہ سے ہوتا ہے اور ولی دکنی تک پہنچتا ہے۔ دکنی دور کی شاعری میں دکن کا زمانی تناظر کھُل کر سامنے آتا ہے۔ بادشاہوں کی علم دوستی، ان کے کارنامے سخاوتیں، غیض و غضب کا ذکر بھی طویل دکنی مثنویوں میں ملتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے کدم راؤ پدم راؤ کی تحقیق و تدوین کر کے دکنی دور میں مزید تحقیق کے چراغ روشن کیے ہیں۔ اس بات سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ادب کی ابتدا سے ہی اس میں معاشرتی پیچیدگیوں کا تذکرہ موجود ہے۔

بادشاہ فرخ سیر کا اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ ظلم اور اس دور کے مشہور شاعر جعفر زٹلی کو ہجو کے بدلے دردناک موت دینا تاریخ کی پیشانی پر ایک بدنما داغ ہے۔

سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر
بادشاہِ تسمہ کش فرخ سیر

(جعفر زٹلی)

مذکورہ بالا شعر میں فرخ سیر کو اس کے زمانی حقائق کا عکس دکھایا گیا جسے وہ برداشت نہ کر سکا اور شاعر کو موت کی سزا سنا دی۔ اُردو شاعری کا ابتدائی دور غزل کا دور ہے جس میں ہمیں غزل کی مکمل حکمرانی نظر آتی ہے اور باقی اصناف بطورِ رعایا غزل کے سامنے ہیں۔ غزل رمز و ایما کی صنف ہے جس میں تلخ حقائق کا بیان ممکن تو

ہے مگر آسان نہیں کیونکہ جس آنگن میں غزل نے پرورش پائی وہاں اس کے شب و روز گل و بلبل، شمع و پروانہ کے ساتھ گزرے مگر یہ شعرا کا کمال رہا ہے کہ انہوں نے اردو غزل میں علامات و تلازمات کے ذریعے معاشرتی صورت حال کی عکس بندی کی اور اُردو شاعری کو معاشرے کی زبان بنایا۔اُردو غزل کا حال اس دوشیزہ کی طرح ہے جس کے چاہنے والوں میں سبھی شامل ہوتے ہیں پارسا بھی اور گنہگار بھی، جوان بھی اور بوڑھے بھی، غزل کا ساتھ سماج سے اتنا پُرانا ہو چکا ہے کے یہ محرم راز کی شکل اختیار کر چکی ہے یہ معاشرے میں بیک وقت عالم کے پاس بھی ہے اور رند کے ساتھ بھی شاہ کے محل میں بھی ہے اور گدا کی جھونپڑی میں بھی یہ معاشرے کی ہم سفر بھی ہے اور معلم و رہبر بھی ہے، غزل کے دو مصرعے کسی کے رفیق غم ہوتے ہیں تو کسی کی مباحث کو مہمیز کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ غزل انسانی قلب و نظر کی رسائی سے بھی اتنی ہی واقف ہے جتنی اس کی گہرائی سے غزل جہاں دوسروں سے آگاہی دیتی ہے وہیں اپنے مافی الضمیر کو سمجھنے میں بھی کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔

غزل سماجی ارتقاء کی تحریری دستاویز ہے۔اس نے قوموں کا عروج و زوال دیکھا ہے۔غزل سماجی رنگوں، بدلتے ہوئے حالات کی آئینہ دار ہے۔ہماری تہذیب غزل میں اور غزل ہمارے تہذیب میں رچی بسی ہیں۔تہذیب و غزل کے تعلق کا یہ عالم ہے کہ کبھی تہذیب وجود معلوم ہوتی ہے اور غزل اس کی روح اور کبھی یہ سلسلہ معکوس ہو جاتا ہے۔غزل خیال، زبان، ہیئت، اور جذبے کے آمیزے کا نام ہے جس کی مدد سے برسوں سے بیماری دل کا علاج کیا جاتا ہے۔غزل ایک ہمہ گیر صنفِ ادب ہے جس میں مقامیت سے لی کر آفاقیت تک، ظاہر سے باطن تک، اعلیٰ سے ادنیٰ تک، خودغرضی سے لیکر اخوت تک سبھی کچھ موجود ہے۔غزل جہاں ہر غزل گو کے داخلی جذبات کا بیانیہ ہوتی ہے وہیں تمدنی حالات کا احاطہ بھی کرتی ہے۔

ادبی تخلیق بالخصوص شاعری کسی نہ کسی حد تک معاشرے کے تابع ضرور ہوتی ہے اور اس میں فعل، انفعال و تفاعل کی جتنی صورتیں نظر آتی ہیں ان میں کوئی نہ کوئی محرک ضرور ہوتا ہے جس کا تعلق سماج سے جڑا ہوتا ہے۔غزل کا تعمیری تعلق جذبات و احساسات سے ہے، غزل کا شاعر وہی کچھ بیان کرتا ہے جو وہ محسوس کرتا ہے اور چونکہ شاعر معاشرے کا اہم فرد ہوتا ہے تو اس کا بیان کیا گیا دوسرے لوگوں کے جذبات کا عکاس بن جاتا ہے اور اسی طرح آپ بیتی 'جگ بیتی' کا روپ دھار لیتی ہے۔غزل کے موضوعات میں زمانے کی کروٹوں کا حصہ شامل ہوتا رہا ہے مگر غزل کا بنیادی موضوع محبت و عشق کا بیان ٹھہرا اس بیان کے لیے جب خارجی عناصر کو بطور علامت استعمال کیا گیا وہ صحنِ غزل سے رخصت نہ ہو سکے۔اسی خوبی کی بدولت زمانے کی زبوں حالی، معاشرتی

مسائل، ظلم وستم کو غزل میں ایسے انداز میں بیان کیا گیا کہ غزل کا سنجیدہ قاری واہ بھی کرتا ہے اور آہ بھی ۔ میرؔ نے دلی کی ویرانی کو دل کی ویرانی کہہ کر یوں بیان کیا ہے:

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

غزل کے پیرائے میں شعراء نے عشق کو موضوع بنایا اور حقیقت اور مجاز کے بیان سے اسے مزید وسعت دی۔ بقول غالبؔ:

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے ساغر و مینا کہے بغیر

اُردو غزل کا بیانیہ آج بھی قدیم الفاظ سے سجا ہوا ہے، زمانے کے ارتقا کے ساتھ اردو غزل نے بھی ارتقائی منازل طے کی ہیں اور الفاظ و علامتوں نے نئی پوشاکیں پہن لی ہیں جس میں لامحالہ زمانے کی کارفرمائی ہے۔غزل کی موضوعی جدت اور روایتی وابستگی کے حوالے سے پروفیسر حمید احمد خان کہتے ہیں:

''غزل جدت موضوع سے بیزار نہیں ہے لیکن بیان کی ایک پرانی روایت سے وابستہ ضرور ہے اس وابستگی کے بغیر غزل کمال گویائی سے محروم ہو جاتی ہے۔ دو مصرعوں کی حد کے اندر بہت کچھ کہا جانا خاص قسم کی زبان استعمال کیے بغیر ممکن نہیں ہے۔غزل میں جو لفظ استعمال ہوتا ہے وہ محض لفظ یعنی کسی شے یا تصور کی علامت ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ کسی داستان یا پسِ داستان یا پسِ منظر کا ٹکڑا ہوتا ہے۔غزل کی زبان انہی ٹکڑوں کو جوڑنے سے بنتی ہے اور اس طرح اس جہانِ معنی کی تعمیر ہوتی ہے جسے ہم غزل کی بیت کی حیثیت سے پہچانتے ہیں۔غزل کی یہ مخصوص معنویت لفظوں کی جداگانہ ہستی تک محدود نہیں ہے۔الفاظ و تراکیب کے باہمی روابط ایک طویل شجرہ نسب کی مدد سے غزل کو منور و ہم مرکز دائروں تک وسیع کرتے چلے جاتے ہیں''۔۴۸

اُردو غزل کی ابتدا کے حوالے سے دیکھا جائے تو مذہب اور تصوف کی آمیزش نے رنگِ تغزل کا زیادہ نمایاں نہیں ہونے دیا۔ باوا آدم ولی دکنی کی غزلیات میں مضامین کا تنوع نہیں ہے، ایک ہی مضمون کو مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے، نیز ولی کی شاعری میں ہمیں ماحول، زبان، ثقافت کی جھلکیاں ضرور ملتی ہیں۔ دکن کے بعد شمالی ہند جب اُردو شاعری کا مرکز کہلایا تو گی زمانی حالات کی تبدیلی نے غزل پر بھی اپنے اثرات مرتب کیے اور ماحول کے مطابق یہاں کے شعراء نے داخلیت کو فروغ دیا اور معاشرے کے حالات، دنیا کی بے ثباتی کو دکنی

دور سے زیادہ اپنے کلام کا موضوع بنایا۔ شمالی ہند کے نا مساعد حالات کی بناء پر جب شمع محفل اودھ لکھنو میں روشن ہوئی تو پروانوں کا ہجوم بھی لکھنو کی طرف عازم سفر ہوا اور وہاں کے زمانی حالات، زمینی حقائق، مزاج، عادات واطوار، فطرتی رنگ، جمالیاتی ذوق، نے اردو ادب کو خارجی عناصر کا خزانہ عطا کیا۔ شمالی ہند میں جس قدر داخلیت کی دراندازی تھی لکھنو میں اس قدر خارجیت کی شمولیت تھی۔ لکھنوی دور تک غزل ہر محفل کا آغاز بھی تھی اور انجام بھی مگر شاید بعض افراد کو غزل سے ہر وقت کی محبت یہ لاڈ پیار پسند نہیں آیا اُردو غزل میں معاشرے کی کروٹوں کے ساتھ موضوعاتی تنوع آیا۔ جس میں ہر شعبہ ہائے حیات سے تعلق رکھنے والے شخص کی ترجمانی کا عنصر موجود ہے۔ ۱۸۵۷ء کے حالات ہندوستانی معاشرے کے لیے افراط وتفریط کا سبب تھے۔ ایسی ہیجانی کیفیت میں جب ہر طرف آگ وخون کی ہولی کھیلی جا رہی ہو اپنا ملک آنکھوں کے سامنے پرایا ہوتا نظر آئے لال قلعے پر مغلیہ فرمانرواوں کی بجائے برٹش راج کی سر بلندی کا نشان لہرانے لگے تو ایسے میں کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے کہ شاعر اپنے مافی الضمیر کا اظہار نہ کرے۔ دلی میں بہادر شاہ ظفر جو کہ خود شاعر تھے اور ادب کے دردان تھے اپنے بزرگوں کی بنیاد رکھی گئی سلطنت میں آخری دن گزار رہے تھے اُدھر اودھ میں واجد علی شاہ کو معزول کر دیا گیا تھا اس دور میں لکھنؤ سے دلی تک سب جگہ خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ ایسے دور میں سیاسی حوالے سے سرسید احمد خان، مولانا شبلی اور ان کے رفقائے کار پیش پیش تھے۔ غالبؔ وحالیؔ جیسے شاعری کے دو بڑے دماغ براہ راست حالات کو دیکھ رہے تھے۔ حالی نے مسدس حالی کے ذریعے عوام کے دلوں کی ترجمانی کی۔ اس کے ساتھ ساتھ 'مقدمہ شعر وشاعری' لکھ کر جہاں اُردو ادب میں تنقید کی ابتدا کی وہیں انہوں نے اُردو غزل کے حوالے سے تنگ دامنی کا اظہار بھی کر دیا۔ ڈاکٹر سنبل نگار لکھتی ہیں:

> ''حالی کو غزل میں سنڈاس کی بدبو محسوس ہوئی، کلیم الدین احمد نے اسے نیم وحشی صنفِ سخن قرار دیا، عظمت اللہ خان نے مشورہ دیا کہ غزل کی گردن بے تکلفی سے اُڑا دینی چاہیے''۔۴۹

لہٰذا حالی ہی وہ نقاد ہیں جن نے بڑی شد ومد سے غزل پر اعتراضات کیے انہیں مضمون، موضوع سے لے کر تکرار خیال تک سب عیوب ہی غزل میں نظر آئے بعد میں آنے والے حضرات نے بھی غزل پر اعتراضات کو ہوا دی اور اس آگ کو بجھنے نہیں دیا۔ مگر غزل نے ہر آنے والے شاعر کا خیر مقدم کیا۔

اس زمانے میں بھی حسرتؔ کی شکل میں ایسا غزل گو موجود تھا جو غزل کی آبرو کو برقرار رکھے ہوئے تھا ۔ ۱۸۶۵ء میں ۵۷ء کے ہنگاموں کی وجہ سے پیدا ہونے والا ادبی تعطل کا سلسلہ جب دوبارہ شروع کرنے کا سوچا گیا تو اس کے لیے مختلف علاقوں میں علاقائی سطح پر ادبی سوسایٹیاں قائم کی گئیں۔ جن کا مقصد عوامی سطح پر

پیدا ہونے والے جمود کو توڑنا تھا۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے جہاں ملک کے طول وعرض میں علمی و ادبی تنظیمیں قائم کی گئیں وہیں لاہور میں انجمن پنجاب کے نام سے ایک سوسائٹی بنائی گئی جس کے مقاصد میں سیاسی وسماجی تھے۔ انجمن پنجاب میں مولانا محمد حسین آزاد نے سب سے پہلے غزل کے حوالے سے بحث کو طول بخشا جس میں کہا گیا کہ شاعری میں جہاں عشق و عاشقی، ہجر و وصال، شمع و پروانہ کا ذکر کیا جاتا ہے وہیں مناظر فطرت کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے جس کی تصدیق کے لیے انہوں نے اپنی نظم 'شبِ قدر' پڑھ کر سنائی اور غزل کی محدودیت پہ مکمل لیکچر بھی انجمن کے جلسے میں دیا۔ گویا شبِ قدر نظم کو غزل کی پہلی سوتن کہا جا سکتا ہے۔

انجمن کے مشاعروں میں غزل کے برعکس مصرع طرح کی بجائے شاعروں کو موضوع تفویض کیا جاتا تھا جس پر طبع آزمائی کے بعد شاعر اپنی نظم انجمن کے مشاعروں میں پڑھتے تھے۔ اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ بیسویں صدی سے قبل باقاعدہ طور پر ہمیں سوائے حالؔی کی 'مقدمہ شعر و شاعری' اور امداد امام اثرؔ کی 'کاشف الحقائق' کے علاوہ غزل یا مکمل ادب کے حوالے سے تنقیدی سنگِ میل نظر نہیں آتے اس سے پہلے اشارے تو موجود ہیں مگر منظّم انداز میں خیالات کو قلمبند نہیں کیا گیا۔ اگر یوں کہا جائے کہ اس دور میں غزل پر تخیلاتی، موضوعاتی تجربات کیے گئے تو بے جا نہ ہوگا لیکن اس میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بالکل ہی غزل نہیں کہی گئی یا غزل سے روگردانی اختیار کی گئی۔ بلکہ حقیقت میں غزل کا ڈکشن تبدیل کرنے کی کوشش کی گئی حالؔی نے اپنے دیوان میں اپنی ابتدائی زمانے کی غزلوں کے ساتھ 'ق' لکھا ہے کیوں کے ان میں کلاسیکیت، داخلیت، رمز و ایمائیت موجود ہے۔ اسی طرح اکبرالہٰ آبادی نے غزل میں نئے موضوعات بالخصوص خارج کے مشاہدے کو بیان کرنے کی کوشش کی۔ اکبر کی غزلیات سے ایسے خشک مکالمے کا گماں ہوتا ہے جس میں بس ایک انسان ہی بول رہا ہو اور دوسرا انسان جواب دینے کی زحمت بھی نہیں کر رہا۔ اس کے برعکس چکبست کی غزلیات میں قدیم رنگِ تغزل، داخلیت، قلبی واردات کے عناصر بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ اس دور کے بڑے غزل گو شعرا میں شادؔ عظیم آبادی کا نام سرِفہرست ہے جنہوں نے غالبؔ کے بعد پریشان اُردو غزل کو ڈھارس بندھائی البتہ اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ شادؔ کو وہ ادبی توجہ میسر نہیں آئی جو ان کا حق تھا جس کی وجہ سے ان کی شاعری کی تفہیم نہیں ہو سکی۔ شادؔ کے ہاں روایت کی پختگی اور جدت کی چاشنی موجود ہے۔ یہ وہ سلسلہ ہے جس کو اصغرؔ، فانیؔ، حسرتؔ وغیرہ نے پوری شد و مد کے ساتھ جاری رکھا اور انیسویں صدی کی شعری امانت کو بیسویں صدی کی دہلیز تک پہنچایا۔

بیسویں صدی میں جہاں نظم میں سیاسی اور سماجی عناصر کی آمیزش مزید زور پکڑ رہی تھی وہیں غزل بھی

نئے فکری سانچے میں ڈھل رہی تھی ۔اس دور میں اردو ادب کو ایسے ادیب میسر آئے جنھوں نے فلسفہ، منطق، تاریخ، سماجی سائنس کو سماجی مسائل سمجھنے کے لیے استعمال کیا۔ بیسویں صدی کے آغاز سے لے کر آخر تک اس کی سب سے بہترین مثال علامہ اقبال ہیں جنھوں نے اپنی شاعری سے بیداری قوم جیسا مشکل فریضہ بہ طریق احسن انجام دیا۔ بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی قدیم و جدید کی مباحث نے معاشرے کو آگھیرا ادیب جس محفل و مجلس میں اکٹھے ہوتے نئی غزل اور پرانی غزل کی گفتگو لازما موضوع بحث بنتی ۔بعض ادبا و ناقدینِ فن نے حسرتؔ کو نئی غزل کا امام کہا اور انہیں رئیس المتغزلین کے القاب سے ملقب کیا۔ بیسویں صدی میں جو بڑی تبدیلی دیکھنے میں آئی وہ یہ تھی کہ اُردو غزل پر باہر کی دنیا کے اثرات بھی تیزی سے پڑ رہے تھے بیسویں صدی کے پہلے عشرے میں جنگِ عظیم کے خطرات منڈلانے لگے تھے۔ جس کے نتائج ۱۹۱۴ء میں سامنے آئے ۔ اتنی بڑے سماجی تبدیلی نے جہاں پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لیا وہاں کیسے ممکن تھا کہ اُردو ادب پر اس کے اثرات مرتب نہ ہوتے ۔اس کے ساتھ ہی انقلاب روس اور اشتراکیت کے نظریے نے معاشروں کو اپنی لپیٹ میں لیا۔ ہمارے معاشرے میں ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کا ظہور اس کی مثال ہے ۔ یہ تمام عصری رجحانات کسی نہ کسی حوالے سے ادب پر اثر انداز ہو رہے تھے ۔بیسویں صدی کا ادب زیادہ تر انفرادی رویوں کو اجاگر کرنے کا ادب ہے جس میں فرد کا معاشرے سے تعلق اس کو درپیش مسائل اور ان مسائل کے حل کے لیے اظہارِ خیال کیا گیا۔ حالیؔ جس مقصدی ادب کا خواب دیکھتے تھے اس کی تعبیر علامہ اقبال کی صرف افادی شاعری شکل میں سامنے آئی مگر علامہ نے مقصدیت و افادیت کو اپنی شاعری میں نازک خیالی کے ذریعے داخل کیا اور فلسفیانہ مباحث کو اپنے مخصوص انداز میں بیان کر کے عوام کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی۔ اقبال کو زمانے کا نباض کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ علامہ نے مغربی ماحول کو جس انداز میں سمجھا اور وہاں سے استفادہ کیا وہ کسی اور شاعر کے ہاں ہمیں نہیں ملتا انہوں نے معاشرے کے حالات کو بھانپتے ہوئے قلم کے ذریعے اظہارِ خیال کیا۔ اقبال کے کلام میں جہاں نظموں میں فکری ارتقا کی کیفیت موجود ہے وہیں غزلیات میں بھی یہ کیفیت موجود ہے ۔ بالِ جبرئیل کی غزلیں اقبال کے فکری ارتقا کا پتہ دیتی ہیں ۔

بیسویں صدی کے نصفِ اول میں فانیؔ ایسا غزل گو ہے جس کو شمار کرنا لازم ہے ۔ فانیؔ کے کلام میں موت و زندگی کی حقیقتوں کا رنگ نمایاں ہے ۔ غزل گوئی کے حوالے سے یگانہؔ کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں یگانہ کی غزل میں رعب و طنطنہ اپنے عروج ہے بعض مقامات پر وہ انداز بیان کھوکھلا بھی محسوس ہوتا ہے جس سے قاری کو الجھن محسوس ہوتی ہے شاید یہ غزل کی لطافت پسندی کی وجہ سے ہے ۔ فراقؔ کا نام غزل گویوں میں منفرد

مقام کا حامل ہے ان کے کلام پر جس قدر تنقید ہوئی اس سے ان کے کلام کو نقصان کم اور فائدہ زیادہ پہنچا۔ فراقؔ جہاں ترقی پسند ہے وہیں کلاسیکیت سے بھی رشتہ قائم رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں جن میں سب سے اہم ترقی پسند تحریک کا قیام تھا اس تحریک نے مجموعی طور پر ادب کو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ یہ بات الگ ہے کہ منشور پر عملدرآمد تحریک کی ہاؤ ہو جتنا نہیں ہوا۔ لیکن اس تحریک نے یقینی طور پر ادباء کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ غزل کو بھی ترقی پسند غزل اور غیر ترقی پسند غزل کے حصوں میں بانٹنے کی کوشش کی گئی۔ ترقی پسند خیال کے تحت جن شعرا نے غزلیں لکھیں ان میں سرِفہرست فیض احمد فیضؔ ،علی سردار جعفریؔ ، مجروحؔ سلطان پوری ،مخدوم محی الدینؔ اور غلام ربانی تاباںؔ ہیں ۔ان میں فیضؔ نے تو پورے ادبی منظر نامے کو متاثر کیا جب کہ باقی شعراء کسی حد تک اپنے ترقی پسند نظریے کے تحت عہد کو متاثر کرنے میں کامیاب ہوئے۔

تقسیمِ ہند کے ہنگامے اور آزادی کے مراحل ایسے ہولناک مناظر تھے جن سے کم و بیش ہر ادیب متاثر ہوا۔ اس دور کے شعراء نے قریب سے مناظر شہر آشوبی دیکھے۔ اس ماحول میں بہت سے شعرا نظر آتے ہیں ایک طبقہ ایسے شعرا کا ہے جو بھارت سے پاکستان ہجرت کر آئے اور دوسرے شعراء یہیں مقیم رہ کر غزل کے ذریعے خدمتِ ادب کرتے رہے ان میں ایسے شعرا بھی تھے جو عمر کا کافی حصہ ادب کی سرائے میں کاٹ چکے تھے ان میں سیماب اکبرآبادی ، بہزاد لکھنوی، آلِ رضا، چراغ حسن حسرت ، ایم ڈی تاثیر، صوفی تبسم ،عبدالحمید عدم کے نام اہمیت کے حامل ہیں ان میں بہت سے لکھنے والے تو پہلے سے ہی شہرت دوام حاصل کر چکے تھے۔ البتہ باقی شعرا کے لیے امتحان کا وقت تھا کہ وہ کس انداز سے اپنے آپ کو منوانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ تقسیم کے بعد کی غزل کو 'پاکستانی غزل' کی نام سے یاد کیا جاتا ہے جس میں فیض ، ناصر کاظمی ،احسان دانش، جوش ملیح آبادی ، باقی ہوشیار پوری ، حفیظ جالندھری، ابن انشا، عبدالحمید عدم ،کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ وہ غزل گو تھے جو کلاسیکیت سے جڑے ہوئے نئے موحول کی کروٹوں کو دیکھ رہے تھے جوشؔ بنیادی طور پر نظم کہتے تھے مگر جدید غزل گویوں میں اہم مقام حاصل ہے ۔ان کی غزل میں انقلابی روش موجود ہے جو کسی نہ کسی حد تک غزل کا مزاج نہیں ہے۔ ناصر کاظمیؔ نہ ترقی پسندی کے زیر اثر غزل کہنے والوں میں سے ہیں اور نہ ہی ماحول کا نوحہ کہنے والوں میں سے ہیں ،ناصر کاظمی اپنا جہاں خود بناتے ہیں ۔ان کی شاعری میں عصری حسیت کے واضح نمونے ملتے ہیں ۔یہ دور غزل کے لیے کٹھن دور تھا۔ ترقی پسند تحریک اور حلقہ اربابِ ذوق کے نظریات کی وجہ سے غزل کی بجائے نظم کو قبولِ عام ہو رہا تھا شاعر اپنا فکری سرمایہ نظم کی صورت میں عام پر لا رہے تھے۔ لیکن اس زمانے میں

بھی غزل کے کچھ نام ایسے تھے جنہوں نے غزل کو جدید رجحانات سے آشنا کرایا اور دامنِ غزل کو وسیع کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ان میں احمد فراز، منیر نیازی، سلیم احمد، شہزاد احمد، احمد مشتاق جیسے غزل گویوں کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

مندرجہ بالا بحث میں غزل کے ارتقاء اور زمانے کی بدلتی رتوں کے ساتھ غزل کو درپیش خطرات، مسائل کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں ہم اردو غزل کے اہم ترین غزل گویوں کا ذکر 'عصری حسیت' کے تناظر میں کریں گے تاکہ غزل کا معاشرتی آہنگ واضح ہو سکے۔

نئی تحقیق کے مطابق ولی سے پہلے غزل کے دو دور گزر چکے تھے، مگر اولیت کی بحث سے قطع نظر ولی دکنی کی شاعری احساسات کی شاعری ہے، ولی جس زمانے میں اشعار کہہ رہے تھے اُس وقت جنوبی ہند مستحکم حالات میں تھا اور قطب شاہی خاندان کے آٹھ فرمانروا گزر چکے تھے گویا معاشرتی و اقتصادی طور پر حالات سازگار تھے اور ولی دربار سے بھی وابستہ تھے۔ ولی نے فارسی غزل کے تقریباً مضامین کو ریختہ میں اپنایا اور زبان کے ارتقائی مراحل کے باوجود خوب اپنایا، ولی کی شاعری ہمیں دکن میں زبانوں کے علاقائی امتزاج کی تصویر بھی دکھاتی ہے۔ ولی نے شاعری میں جمالیاتی عناصر کو بھرپور انداز میں بیان کیا:

دیکھنا ہر صبح تجھ رخسار کا
ہے مطالعہ مطلع انوار کا

یاد کرنا ہر گھڑی تجھ یار کا
ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا

ترے دو نین دیکھوں جب نظر بھر
مجھے تب نرگستاں یاد آوے

ترے مُکھ کی چمن کو دیکھنے سوں
مجھے فردوسِ رضواں یاد آوے

ولی کی شاعری عصری شعور کے پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے، کیونکہ ولی کی شاعری سے ہی ہم ولی کے زمانے کی صورت حال سے آگاہ ہو سکتے ہیں، ولی کی غزل لوازماتِ غزل سے بھرپور ہے۔ بطورِ فرد ولی ذوق اور احساس سے بھرپور ہے۔ جس کا اظہار اس کی شاعری میں ہمیں ملتا ہے۔ ولی کی شاعری میں معاشرتی عوامل کا

بیان زیادہ ہے، ولی اپنے خارج سے ہی اپنی شاعری کی نمو کرتا دکھائی دیتا ہے۔ ولی کا معاشرہ تصوف کی طرف راغب تھا نظریہ وحدت الوجود کی جڑیں مضبوط تھیں جس کا عکس ولی کے ہاں بھی نمایاں ملتا ہے:

حُسن تھا پردہ تجرید میں سب سوں آزاد
طالبِ عشق ہوا پردہ انسان میں

ولی کی شاعری کے مطالعے سے ہمیں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ولؔی اپنی شاعرانہ عظمت سے بخوبی آگاہ تھے اور اس بات کا ثبوت ان کے کلام میں شاعرانہ تعلّی کا ملنا ہے:

گوہر اس کی نظر میں جا نہ کرے
جس نے دیکھا ہے آب و تابِ سخن

عرفیؔ و انوریؔ و خاقانیؔ
مجکوں دیتے ہیں سب حسابِ سخن

ولؔی کی شاعری میں اس کا معاشرہ دیکھا جا سکتا ہے ولی کی شاعری میں موجود تصوف کو پروفیسر وہاب اشرفی عصری

حسیت سے جدا نہیں سمجھتے وہ کہتے ہیں:

''ایک زمانے میں دکن میں الواروں کی بھگتی بہت مشہور تھی۔ جس کا عہد قبل از مسیح سے شروع ہوتا ہے، ایسی بھگتی میں دوستی غلامی، شفقت، اور حُسن کے جذبے کی آمیزش تھی۔ کیا یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ ولی کے تصوف میں جس طرح دوستی، شفقت، اور حُسن کے جذبے کی عکاسی ہوتی ہے، اس کا رشتہ الواری بھگتی سے ملتا ہے''۔۵۰

ولؔی کے بعد کا زمانہ دکن میں خاص اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ ولؔی کی شمالی ہند آمد اور مقبولیت کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ ولؔی علم و ادب کی برکتیں شمالی ہند کو میراث میں عطا کر گئے کیونکہ دکن میں بعد از ولؔی، سراجؔ کا نام آتا ہے جس نے دکنی ادب پر گہرے نقوش چھوڑے۔ گو کہ بعد میں شاہ مبارک آبروؔ، شرف الدین مضمونؔ، شاہ ظہور الدین حاتمؔ، شاکر ناجیؔ علی الترتیب دکن میں شاعری کی دنیا میں موجود رہے مگر کوئی خاص نقش اُبھارنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ لیکن شاعری اور زبان کی ابتدا کے حوالے سے انہوں نے خدمات انجام دیں جن میں خارجی زبان کو مقامی زبانوں کے ساتھ مخلوط کر کے زبان کو وسعت بخشی، مقامی الفاظ کی آمیزش سے لوگوں کو

سمجھنے میں مدد ملی جس سے ادبی دائرے میں وسعت آئی۔اس دور کی اہم بات ادب میں ایہام گوئی، ریختی جیسی اصناف کی آمد ہے جس سے اس زمانے رویوں اور رجحانات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔اس دور میں زبان کی صفائی کا عمل بھی شروع ہوا مگر پھر بھی زبان اپنے واضح نقوش ابھارنے میں کامیاب نہ ہوسکی۔ بگڑتے ملکی حالات نے بھی ادبی منظر نامے پر اپنی چھاپ کو ابھارا جس کی وجہ سے اشرف علی فغاںؔ اور دیگر شاعروں کے ہاں قنوطی عنصر ملتا ہے۔عشق و محبت میں تصوف کی آمیزش بھی موجود ہے گویا یہ کہا جائے تو بے جا ہوگا کہ میرؔ کے سوز و گداز و دردؔ کے تصوف کے لیے زمانی تمہید شروع ہو چکی تھی۔

اُردو غزل کی زمانی تقسیم کے لحاظ سے دکنی دور کے بعد شمالی ہند کا زمانہ آتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں اُردو غزل میں متنوع موضوعات کو کلام کا حصہ بنایا گیا۔ اس دور کے غزل کے حوالے سے سب سے اہم شاعر میر تقی میرؔ ہیں۔

میر تقی میر (۱۷۱۰ء۔۱۸۲۲ء) میرؔ اُردو شاعری میں عصری تقاضوں کے حوالے سے اہم ترین شاعر ہے۔جس کی شاعری عصری حسیت کی آئینہ دار ہے۔ میر کی شاعری کو اگر اس دور کی منظوم تاریخ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

سنتے ہو ٹک سنو کہ پھر مجھ بعد
نہ سنو گے یہ نالہ و فریاد

(دیوان اول)

میرؔ کی مشاہداتی سطح زمانی اعتبار سے دوسرے شعرا سے کہیں زیادہ ہے۔ان کے ہاں طبقاتی کشمکش کی آگہی نظر آتی ہے۔ میرؔ اپنے زمانے میں موجود افراط و تفریط کو بغور سمجھتے ہیں۔

دل ہوا ہے چراغ مفلس کا
شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہوں

(دیوان اول)

میرؔ کی شاعری اٹھارہویں صدی کے نصف سے انیسویں صدی کے اوائل کی شاعری ہے۔ میر کا زمانہ انتشار کا زمانہ تھا،اور اس پر مستزاد میر کے اپنے حالات بھی دہلی سے کچھ الگ معلوم نہیں ہوتے۔مندرجہ ذیل غزل کا پس منظر میر کی لکھنو آمد بیان کیا جاتا ہے۔

میر کے ہاں ہمیں تلخ زمانی حقائق کا انبار ملتا ہے۔میر کی غزل میں معاشرتی زبوں حالی کا عنصر بہت نمایاں نظر آتا ہے۔

خاک بھی سر پہ ڈالنے کو نہیں
کس خرابے میں ہم ہوئے آباد

(دیوان اول)

نہ دردمندی سے یہ راہ تم چلے ورنہ
قدم قدم پہ تھی یاں جائے نالہ و فریاد

(دیوان سوم)

میر کی شاعری زمانے کی نمائندہ شاعری ہے۔ میرؔ ان چند خوش نصیب شعراء میں سے تھے جنہیں قبول عام کی سند ان کی زندگی میں مل چکی تھی، اور میر کی استادی کا اعتراف جن اساتذہ فن نے کیا ہے وہ تو ادب سے وابستہ ہر شخص اس سے آگاہ ہے۔ کسی شاعر کی شاعری کی عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ تین صدیاں گزر جانے کے بعد بھی اس کے کلام کے اسرار مسلسل کھل رہے ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر سید عبداللہ کہتے ہیں:

> ''میر تقی میرؔ کی عام مقبولیت کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ان کی شاعری میں خواص اور عوام دونوں کے لیے اپیل موجود ہے۔ عوام کے لیے یہ کہ ان کا لہجہ اور بات کہنے کا انداز ایسا ہے جو عام فہم ہی نہیں بلکہ ان فطری حالتوں، کیفیتوں اور ماہیتوں کے قریب اور مطابق ہے جن سے عوام بے حد مانوس ہیں۔ خواص کے لیے اپیل کی صورت یہ ہے کہ عام فہم اندازِ بیان اور کسی حد تک عوامی لہجہ و فضا کے باوجود میرؔ کی شاعری روایتی اسالیب اور خاص پسند صنعت کاری کے اعتبار سے بھی بلند درجہ رکھتی ہے اور اس مذاق کی تشفی کا پورا سامان مہیا کرتی ہے جو مضمون کی سچائی اور تجربے کی صداقت کی طرح یا اس سے بھی زیادہ کلام کے صوتی لذائذ یا خارجی حسن کاری کا دلدادہ ہے۔ پس اگر عوام ان کی شاعری کو اپنی شاعری سمجھ کر جان دیتے ہیں تو خواص بھی اس کے اعلیٰ صناعتی اور فنی محاسن سے بدرجہ اتم محضوظ ہوتے ہیں''۔ ۵۱

مندرجہ بالا اقتباس اس بات کو ثابت کر رہا ہے کہ میر کی شاعری 'روح عصر' کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ میر کے زمانے میں زندگی کی پیچیدگیاں، معاشرتی ناہمواریاں اپنے عروج پر تھیں اور میر سے ان کے رشتے داروں کی بے وفائیاں انہیں بھولی نہیں جس کا ذکر وہ نصیحت کی شکل میں کرتے ہیں کہ احباب، رشتے دار

،برادری سب کچھ سانس تک ہے بعد میں کوئی کسی کا نہیں ۔میرؔ بطور شاعر اس معاشرے کا کا جیتا جاگتا باشعور رکن تھا۔جو نہ صرف کرب سے گزرتے انسانوں کو دیکھ رہا تھا بلکہ خود اس کرب سے گزر بھی رہا تھا اسی لیے میر کہتے ہیں۔

مرتا ہے کیوں تو ناحق یاری برادری پر
دنیا کے سارے ناتے ہیں جیتے جی تلک کے

کہتے ہیں گور میں بھی ہیں تین روز بھاری
جاویں کدھر الٰہی مارے ہوئے فلک کے

(دیوان اول)

میرؔ اپنی حالت کا قصور وار زمانے کے حالات کو نہیں سمجھتے بلکہ اپنے اردگرد نظر کرتے ہوئے جب اپنے سا کوئی نہیں دیکھتے تو 'اتفاق' کا لفظ استعمال کرتے ہیں جو شعر میں ذومعنویت پیدا کر رہا ہے ۔

میرے تغیر حال مت جا
اتفاقات ہیں زمانے کے

(دیوان اول)

میرؔ کی شاعری میں موت کا تذکرہ اس انداز سے موجود ہے کہ جیسے موت فنا کا نہیں بقا کا سلسلہ ہے میر موت بعض اوقات زندگی سے بہتر جانتے ہیں شاید اسی لیے کہتے ہیں۔

لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا
کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزا جانا

(دیوان دوم)

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

(دیوان سوم)

میرؔ کی شاعری میں اجڑے شہر کا استعارہ بار بار ہمیں ملتا ہے جس سے میر کے کرب کا اندازہ کرنا کوئی مشکل نہیں ہے۔

میر معاشرے کی زبان بن کر غم اپنے الفاظ میں سناتے ہیں۔ میرؔ عصری حسیت کے شاعر ہیں زمانے کا ادراک رکھتے ہیں اس کی اقدار و رویوں اور ان میں ہونے والی تبدیلیوں سے بخوبی آگاہ ہیں۔

سبزان تازہ رو کی جہاں جلوہ گاہ تھی
اب دیکھیے تو واں نہیں سایہ درخت کا

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں
تھا کل تلک دماغ جنہیں تاج و تخت کا

(دیوان اول)

میرؔ اپنی شاعری کو دل کا غم بیان کرنے سے تشبیہ دیتے ہیں۔ میرؔ شاعری کو کیتھارسیس کا عمل سمجھتے ہیں جس کا اطلاق وہ اپنے اوپر بھی کرتے ہیں۔ میرؔ کی شاعری کے ایک پہلو پر اچٹتی نظر ڈالتے ہوئے قاضی افضال حسین کہتے ہیں:

> ''بعض اشعار میں غزل کی روایت نے بعض چیزوں کے لیے مخصوص الفاظ متعین کر دیے ہیں۔ مثلاً محبوب کے چہرے کے لیے مصحف یا کعبہ جیسی مقدس چیزیں جس کی اساس صوفیاء کے اس تصور پر ہے کہ محبوب خود ایک انتہائی مقدس ذات ہے۔ اس طرح صوفیاء دل کو آئینے سے تشبیہ دیتے ہیں جسے اُردو غزل کی روایت نے بعینیہ اسی طرح قبول کر لیا ہے۔ میرؔ نے شاعری کی اس اس روایت سے یوں استفادہ کیا ہے کہ کوئی لفظ شعر میں بظاہر عام معلوم ہوتا ہے لیکن اپنی دوسری اشیاء سے تعلق کے پسِ منظر میں اس کے حوالے سے ایک خاص طرح کی روایت اُبھرتی ہے''۔۵۲

جی میں آتا ہے کہ کچھ اور بھی موزوں کیجئے
دردِ دل ایک غزل میں تو سنایا نہ گیا

(دیوان اول)

میر کی زمانی کیفیت گو کہ انتشار و مایوسی کی ہے۔ جس کی وجہ سے قنوطیت کا دور دورہ معاشرے میں موجود ہے مگر میر کے ہاں ایک توازن اور ٹھہراؤ کی کیفیت موجود رہتی ہے وہ جب حد سے زیادہ پریشان ہوتے ہیں تو خدا کی تلاش کرتے ہیں۔ جس سے ضبط و تحمل میں اضافہ ہوتا ہے اور معاشرتی انتشار سے مقابلے کی مزید

ہمت پیدا ہوتی ہے۔

الٰہی کہاں منہ چھپایا ہے تو نے
ہمیں کھو دیا ہے تری جستجو نے

(دیوان دوم)

عشق کو حوصلہ ہے شرط ارنہ
بات کا کس کو ڈھب نہیں آتا

(دیوان اول)

میرؔ کی شاعری میں غم آفاقی حیثیت اختیار کر جاتا ہے، وہ صرف اپنے دکھ کو بیان نہیں کرتے بلکہ دوسروں کی بربادی کو بھی اپنی جان کر اظہار کرتے ہیں:

مجلسوں کی مجلسیں برہم ہوئی
لوگ وے پل مارتے کیدھر گئے

خانوادے ہو گئے کیا کیا خراب
خانہ ساز دین کیسے مر گئے

(دیوان سوم)

میر کی شاعری کے مزاج پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ کہتے ہیں:

"میر کو زندگی سے بیزار شاعر نہیں کہا جا سکتا ان کا غم بعد میں آنے والے شاعر فانی سے مختلف ہے جس کی تان ہمیشہ موت پر ٹوٹتی ہے، ان کا غم سوداؔ سے بھی مختلف ہے۔ ان کا غم ایک مہذب اور دردمند آدمی کا غم ہے جو زندگی کے تضاد کو گہرے طور سے محسوس کرتا ہے کہ ایسی دلکش جگہ اور اتنی بے بنیاد اور محروم"۔ ۵۳

میرؔ کے ہاں ہمیں احتجاج و ضد کی کیفیت ملتی ہے جس کیفیت میں شاعر اپنے معاشرے میں موجود پابندیوں کو توڑنے کے حق میں ہوتا ہے۔ غم و الم کے اس منظر میں بھی میرؔ بے حوصلہ نہیں ہوتے بلکہ جس کی ٹھان لیتے ہیں وہ کر گزرتے ہیں، چاہے انجام جو بھی ہو۔

وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لیے
ہر اک چیز سے دل اُٹھا کر چلے

بہت آرزو تھی گلی کی تیری
سو یاں سے لہو میں نہا کر چلے

کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میرؔ
جہاں میں تم آئے تھے کیا کر چلے

(دیوان اول)

میرؔ کی شاعری میں ایک نمایاں وصف یہ ہے کہ ان کا کلام منظر اور بیان کے درمیان گم نہیں ہوتا۔ بلکہ میر منظر کو جامہء شعر میں قرطاس پر رقم کرتے ہیں۔ میر کی شاعری دقیق فلسفیانہ مسائل کا منبع نہیں ہے بلکہ اس دور کی رائج زبان میں ایک شاعر کی داخلی کیفیات کا دفتر ہے جس میں شاعر نے اپنا مافی الضمیر بیان کیا ہے مندرجہ ذیل اشعار اس بیان کی بخوبی غمازی کرتے ہیں۔

قدر رکھتی نہ تھی متاعِ دل
سارے عالم میں، میں دکھا لایا

دل مجھے اس گلی میں لے جا کر
اور بھی خاک میں ملا لایا

ابتداء ہی میں مر گئے سب یار
عشق کی کون انتہا لایا
اب تو جاتے ہیں بت کدے سے میرؔ
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

(دیوان اول)

میر کی غزل میں جذب و احساس کی کیفیت نمایاں ہے۔ میر اپنے زمانے سے دور رہ کر فقط شاعری کرنے والا شاعر نہیں ہے بلکہ میر معاشرے کا حصہ بن کر عصری شعور سے آگہی رکھنے والا آفاقی تخلیق کار ہے۔
میر کے بعد جس شاعر کے ہاں سب سے زیادہ عصری حسیت نمایاں ہے وہ مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ (۱۷۹۷ء۔۱۸۶۹ء) ہیں۔ غالبؔ ایک شاعر کے ساتھ ساتھ ایک فکر کا نام ہے۔ اگر غالبؔ کو کلاسیک کا نقطہ

عروج اور جدیدیت کا نقطہ آغاز کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اگر یہ کہا جائے کہ غالب نے اردو شاعری کو شعور کی منزل سے ہمکنار کیا تو بے جا نہ ہوگا۔ غالبؔ کے ہاں عصری حسیت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے ۔غالبؔ مسلسل پریشانیوں اور زمانی تلخیوں کے با وجود جینے کی امنگ لیے ہوئے ہے ۔ غالب نے معاشرتی حالات کو ایک حقیقت کے طور پر قبول کیا اور اپنے کلام کا حصہ بنایا۔ غالب کا معاشرہ مکمل تباہ معاشرہ ہے اور غالب نے قلعہ سے منسلک ہونے کی وجہ سے بربادی کا منظر نہایت قریب سے دیکھا ہوگا جس کا اظہار شاعری میں موجود ہے۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

(دیوان غالبؔ ۔نسخہ عرشی، ص ۳۰۸)

غالبؔ مسائل زندگی سے منہ نہیں موڑتا بلکہ انہیں تا دمِ آخر قبول کرنے کی حامی بھرتا ہے۔

غالب کا کمال یہ ہے کہ وہ خود بھی عصری آگہی کا حامل شاعر ہے اور اپنے قاری کو بھی عصری شعور عطا کرتا ہے۔غالب کے زمانے میں حالات کے ابتر ہونے کی وجہ سے بہت سے لوگوں نے نقل مکانی کی اپنے آبائی گھر چھوڑے، اپنا وطن، عزیز و اقارب اپنا سب کچھ چھوڑ کر چلے گئے ۔شمیم حنفی غالب کے زمانی حالات کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں۔

> ''غالب کا زمانہ انسان کی روحانی شکست و ریخت کے احساس سے بھرا ہوا انتہائی مشکل زمانہ تھا ۔حسی اور مادی زندگی کے دو مختلف اور باہم متصادم اسالیب نے اُس زمانے میں اُن لوگوں کے لیے بہت دشواری پیدا کر دی تھی جو نہ تو ایک کو اپنی خوشی سے ترک کرنے پر آمادہ تھے نہ دوسرے کو قبول کرنے پر، جو نہ تو اپنے روحانی وجود سے دست بردار ہو سکتے تھے، نہ گرد و پیش کی حقیقتوں سے لاتعلق رہ سکتے تھے ۔کیا کریں، کدھر جائیں اور جائیں تو کیوں کر اور نہ جائیں تو کیا کریں ۔۔۔غرض کہ سوالوں کی ایک عجیب و غریب کھینچ تان تھی، جس نے غالب کے عہد کو امید اور مایوسی، تضحیک و تحسین کے ایک دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا''۔۵۴

غالب نے اس شکست و ریخت کو محسوس کیا ۔ غالب نے حقائق زمانی سے انحراف نہیں کیا بلکہ اظہار کیا ۔غالب نے دلی کی ویرانی کو بہت قریب سے دیکھا بلکہ حالات کا نقشہ اپنے الفاظ میں ایسے کھینچتے ہیں ۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

(دیوانِ غالب، ص ۱۷۶)

غالبؔ تک آتے آتے اُردو غزل کا آہنگ بہت پختہ ہو چکا تھا، زبان تعمیری دور سے اصلاحی دور میں داخل ہو چکی تھی اور غالب نے اس سے میں مزید اضافہ کیا غالب کی غزل میں تمام زمانی رویے موجود ہیں۔

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے؟ شبِ غم بُری بلا ہے
مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

(دیوانِ غالب، ص ۱۸۷)

غالبؔ کی غزل زمانے سے ہم آہنگ غزل ہے۔ بقول شان الحق حقی: ''غالبؔ اہلِ فکر تھے یعنی انھیں حیات و کائنات اور جمال و جذبات کی اصل و حقیقت کے مسائل سے دلچسپی تھی جس کا اظہار جگہ جگہ ملتا ہے''۔[۴۱] کسی نہ کسی حوالے سے غزل کا قاری زمانے کے ساتھ جُڑا رہتا ہے جس سے وہ مسائل کو سمجھنے کے ساتھ ایک امنگ اور امید بھی محسوس کرتا ہے۔ غالب کے زمانے میں سماجی تبدیلیوں بہت تیزی کے ساتھ ہو رہیں تھیں اس کے ساتھ غالب کا سفرِ کلکتہ ان کی زندگی میں تصوراتی تبدیلی کا باعث رہا کیونکہ غالب نے بالکل نئے معاشرے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور نہ صرف کلکتہ کے تناظر میں بلکہ پورے ہندوستان کے تناظر میں۔ غالب کے دور میں مغرب میں سائنسی ایجادات ہو رہیں تھیں۔ ڈاکٹر احتشام حسین اس حوالے سے رقمطراز ہیں:

> ''غالبؔ ایک نئے نظامِ حکومت اور طرزِ سلطنت سے کسی حد تک واقف ہو چکے تھے، سائنس کی حیرت زائیوں، اور برکتوں کا اندازہ کر چکے تھے۔ اس کی مدد سے انسان کی زندگی میں جو حُسن اور قوت پیدا کرنے کی صلاحیت اس زمانے میں پیدا ہو رہی تھی وہ مغل عہدِ حکومت میں کہاں تھی۔ اس لئے غالب کا نیا شعور جو جاگیردارانہ ہونے کے باوجود بدل رہا تھا۔ دونوں عہدوں کا تقابل کرنے لگا، غالب کی عظمت اس میں ہے کہ انھوں نے ترقی کی علامتوں کو اور سائنس کے امکانات کو اپنے دائرہ تخیل میں جگہ دی''۔ [۴۲]

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

(دیوانِ غالب، ص ۱۳)

غالب کی شاعری میں معاشرتی حالات کے تحت زندگی میں آنے والے امتحانات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ موجود ہے۔

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی ، نہ سہی
امتحاں اور بھی باقی ہو، تو یہ بھی نہ سہی

(دیوانِ غالب، ص ۲۶۶)

غالب کی غزل میں سماجی اقدار کا بیان اس کمالِ فن سے کیا گیا ہے کہ دل میں آہ جنم لیتی ہے اور زبان سے واہ برآمد ہوتی ہے۔

قسمت بُری سہی پہ طبیعت بُری نہیں
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

غالب کی شاعری کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ مکمل انسانی زندگی کا احاطہ کرتی ہے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ جو انسان غمگین ہوگا وہی غالب کا پرستار ہوگا یا پھر وہی انسان غالبؔ کو پسند کرے گا جس کی طبیعت میں مزاح و شوخی کو دخل ہوگا۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری اس حوالے سے کہتے ہیں کہ:

> ''غالبؔ کے نظریہ حیات کی بلندی اس سے ظاہر ہے کہ وہ زندگی میں شادی و غم کو اہمیت نہ دیتے ہوئے بھی زندگی کے لیے اس سلسلے کو ضروری سمجھتے ہیں۔ زندگی ہنگامہ آرائی سے ہے اور ہنگامہ آرائی تضاد سے۔ یکسانی زندگی کا زہر ہے۔ زندگی اختلاف شادی و غم کے تسلسل سے ہے۔ اس زندگی سے بھی انسان اکتا جاتا ہے جس میں رنج و غم کی آمیزش نہ ہو خوشی کی یکسانی کا علاج رنج و الم کے تنوع سے کیا گیا ہے''۔ ۵۷

غالبؔ خود بھی معاشی طور پر کسمپرسی کا شکار رہے اور زمانے کی انحطاط پذیری سے بھی بخوبی آگاہ تھے۔ لوگوں کے معاشرتی، معاشی مسائل کو بھی دیکھ رہے تھے کہتے ہیں۔

فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں!

(دیوانِ غالب، ص ۲۲۴)

غالب کی غزل میں مجموعی طور پر ہمیں عصری شعور نظر آتا ہے، زمانے کے ساتھ فن کار کا جتنا قریبی تعلق ہوگا اتنا زیادہ ہے عصری حسیت اس کی تخلیقات میں نظر آئے گی۔ غالب کی غزلیات میں معاشرتی رجحانات،

رویے اتنی کامل صورت میں موجود ہیں کہ آج کا قاری زمانی اعتبار سے بظاہر فرق کے باوجود بھی غالب کے فن کا قائل نظر آتا ہے۔اس حوالے سے ظ۔انصاری رقمطراز ہیں:

''عقلیت پر زور دے کر جہاں وہ قدیم نظام زندگی سے اپنا جذباتی رشتہ توڑنے کا اعلان کرتا ہے وہیں ایک ایسی زندگی کا طلب گار ہے جہاں انسان سربلند ہو،بستی میں بھوکے ننگے نہ ہوں،تعصب یا تنگ نظری کا ماحول نہ رہے اور آدمی میں عزتِ نفس کا جذبہ قوی ہو۔''۵۸

غالبؔ کے ہاں ہمیں معمولی و غیر معمولی مسائلِ زندگی کا انبار نظر آتا ہے اور ان کا ظہار جس لطیف پیرائے میں غالب نے کیا ہے یہ انہی کا خاصہ ہے۔یوں تو غالب سے اقبال تک زمانی اعتبار سے بہت سے غزل گوشعرا آتے ہیں لیکن ایسا غزل گوشاعر نہیں ملتا جس نے نہ صرف اپنے ہمعصروں کا متاثر کیا ہو بلکہ اپنے عہد کے رجحانات کو دھارا موڑنے میں کامیاب رہا ہو۔اقبال بلاشبہ ایسا شاعر ہے جس نے زمانی رویوں کو بیان کرنے کے ساتھ نئی راہیں تلاش کیں اور نہ صرف اپنے پورے ادبی منظر نامے کو بلکہ ملکی سطح پر بھی اپنے فکری اعتبار سے گہرے نقوش ثبت کئے۔علامہ اقبال (۱۸۷۷ء۔۱۹۳۸ء) کے حکیمانہ خیالات اور فلسفیانہ نظریات کا منبع ان کی شاعری ہے،گوکہ فلسفہ اپنی پیچیدگیوں کے باعث شعر کے قالب میں ڈھالنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے لیکن اقبال نے اپنی اعلیٰ فکری وفنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کارِ مشکل کو بھی بہ طریق احسن انجام دیا ہے۔اقبال سے پہلے یہ کام غالبؔ انجام دے چکے تھے مگر غالب کے کلام کا مخصوص موضوع یا محرک کوئی مخصوص مباحثِ فلسفہ نہیں ہیں،جبکہ اقبال نے اس کام کو مزید آگے بڑھایا ہے۔

اقبال کی غزل ان کی نظم کے مقابلے میں زیادہ متنوع نہیں ہے مگر پھر بھی غزل میں اقبال نے روایت سے ہٹ کر انداز اپنایا ہے۔اس حوالے سے ان کی غزل کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے سید وقار عظیم اس بارے میں کہتے ہیں:

''اقبال دور اول میں جذبات کی سادگی،بیان کی شوخی،اور اظہار کے تیکھے پن کے حوالے سے اسے داخلی کیفیات کی غزل کہا ہے،دوسرے دور کی غزل میں کہیں کہیں بے تابی و خود شناسی کی وہ کیفیت ملتی ہے جو آگے چل کر ان کے پیغام کی روح بنی۔آخری دور کی غزلیات میں اُن عناصر کا پرتو ہے جن سے اقبال کی شخصیت کی تشکیل ہوئی۔''۵۹

اقبال کا فکری ارتقا غزل کے سائے میں پروان چڑھا۔ان کی غزل میں عصری رجحانات موجود ہی مگر

علامہ نے زیادہ تر بیانِ عصر اپنی نظم کے ذریعے کیا۔ کیوں کہ علامہ بنیادی طور پر فلسفی تھے اور غزل کی رمز و ایمائیت میں فلسفے کا ثقیل بیان ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ نئی غزل میں موضوعاتی اضافے کے حوالے سے مزید وضاحت شمس الرحمان فاروقی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''اگرچہ اقبال نے اردو غزل کی روایت میں کوئی اضافہ نہیں کیا، کیوں کہ اخلاقی، فلسفیانہ، بلند آہنگ لہجے والے مضامین تو اردو غزل میں پہلے سے موجود تھے، لیکن پھر بھی انہوں نے غزل کی صنف کو نیا موڑ ضرور دیا۔ اس معنی میں انہوں نے غزل جن عناصر کے گرد تعمیر کی وہ ان سے پہلے کی غزل کا لازمی حصہ نہ تھے۔ ان عناصر کو مرکزی یا تقریباً حیثیت دینے کی وجہ سے اقبال نے یہ بات ثابت کر دی کہ کوئی صنفِ سخن ایک فن پارے میں بند نہیں ہوتی انھوں نے غزل اور نظم کے رشتوں، غزل اور قصیدے کے رشتوں میں تبدیلی پیدا کی اور ہمیں ان مسائل پر از سرِ نو غور کرنے کا موقع فراہم کیا۔ اقبال نے ہمیں اس بات سے آگاہ کیا کہ غزل اور قصیدے کے درمیان کوئی ایسی حدِ فاصل نہیں جسے واجب و لازم سمجھا جائے''۔[۶۰]

اقبالؔ نے جس دور میں غزل گوئی سے اپنے سفرِ سخن کا آغاز کیا اس دور میں ایک طرف تو غزل گوئی میں داغ کا طوطی بول رہا تھا دوسرا سرسید تحریک کے اثرات بھی معاشرے پر بہت قوی صورت میں موجود تھے اور سرسید کے عصری رویوں کی سمجھتے ہوئے عمل کے نتیجے کے طور پر اکبرالہٰ آبادی کا تلخ ردِ عمل بھی موجود تھا۔ لیکن اقبال نے مثبت منفی رویوں سے قطع نظر قوم کے لیے اپنے تخیل کو وقف کر دیا جو ایسا تخلیق کار ہی کر سکتا ہے جس کا فلسفہ حیات موجود قوم کے رائج رجحانات سے وسیع بھی ہو اور وقیع بھی جو ماضی سے نتائج اخذ کر کے حال میں منطبق کرنا جانتا ہو اور مستقبل کے حالات کا ماضی اور حال کے اخذ شدہ نتائج سے درست سمت کی جانب تعین کر سکے۔ اقبال بلا شبہ ایک فطری شاعر ہیں ان کی فطرت پسندی کا اندازہ کائناتی جمالیات کو اپنے انداز میں بیان کرنے سے اور موضوعات کے تنوع سے لگایا جا سکتا ہے۔ اقبال اپنے زمانے کو تہذیبی قدروں سے روشناس کراتے ہیں اور کہتے ہیں:

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ خودکُشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپایدار ہو گا

(بانگِ درا)

اقبال کی غزل میں جو اہم بات دیکھنے کو ملتی ہے وہ یہ کہ انہوں نے غزل کو روایتی انداز سے ہٹ کر استعمال کیا انہوں نے غزل میں عصری حسیت کا بیان یقیناً غالبؔ سے لیا ہے مگر اس کے بیان تک آتے آتے اقبال نے اس شعور کو بہت بلند سطح پر پہنچایا اور بھرپور استعمال کیا۔ اقبال مسائل زیست کے معاملے میں کسی رہبر کا انتظار کرنے کو وقت کا ضیاع قرار دیتے ہیں اور اپنی ذات کو پیش کرتے ہیں۔

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس میرا شعلہ بار ہوگا

(بانگِ درا)

اقبال کی غزل میں مضامین کا تنوع ہی ان کو دوسرے غزل گو شعراء سے ممتاز بناتا ہے انہوں نے غزل کو زمانی آئینہ دار بنایا۔ اقبال کی غزل میں عصری آگاہی کا عنصر نمایاں ہے اگر یوں کہا جائے کہ اقبال نظم میں تو فلسفی پہلے ہے اور شاعر بعد میں اور غزل میں شاعر پہلے اور فلسفی بعد میں وہ اپنی غزل میں اس عام آدمی کی طرح اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں جو اقبال کے دور کے افراد کے جذبات و خیالات کی نمائندگی کرتا ہے۔ اقبال اپنی آگہی اپنی قوم تک جہاں پہنچانا چاہتے تھے وہیں انھیں سمجھانا بھی چاہتے ہیں اسی حوالے سے صوفی غلام مصطفیٰ تبسمؔ کہتے ہیں:

> ''حضرتِ اقبال کا پیغام کیا ہے؟ ان کے خیالات و احساسات کی نوعیت کیا ہے؟ ان کے دماغ کے خلوت کدوں میں کون سے اسرار مضمر ہیں جن کے اظہار کے لیے وہ بے تاب ہیں۔ وہ کون سی آگ ہے جو شرر افشاں آہوں، شعلہ ریز فریادوں اور برق پاش نالوں کے باوجود ابھی تک ان کے سینے میں فروزاں ہے۔ وہ نے نوازیاں، وہ نغمہ سرائیاں کیا ہیں جن سے وہ خود تڑپتے اور دوسروں کو تڑپانا چاہتے ہیں؟ یہ پیغام، رازِ حیات ہے۔ انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کا راز جسے انہوں نے برسوں کی دل سوزیوں، جگر کاویوں، اور اشک ریزیوں کے بعد سمجھا اور اب وہ دوسروں کو سمجھانے کے لیے بے تاب ہیں''۔[۶۱]

اس چمن میں مُرغِ دل گائے نا آزادی کا گیت
آہ! یہ گلشن نہیں ایسے ترانے کے لیے

(بانگِ درا)

مندرجہ بالا شعر آزادی کے لیے ہونے والی جدو جہد کے سلسلے میں ہونے والے مظالم کا عکاس ہے ۔اقبال نے فلسفہ سے زندگی کے مسائل کو نہ صرف سمجھنے کی کوشش کی بلکہ اُن کا حل تلاش کرنے کی کامیاب کاوش میں مصروفِ عمل رہے۔ اقبال انفرادی و اجتماعی طور پر امید کو زندہ رکھنے پر زور دیتے ہیں کیونکہ کسی فعل کی تکمیل کا انحصار اس کے ہونے کی مسلسل چاہت میں مضمر ہے ۔اقبال اپنے زمانے سے آگاہ تھے کہ موجود زمانے میں آزادی کی امید کا ہونا ہی مسلسل عمل اور جدو جہد کا ذریعہ ہے ۔اگر کسی کام کے ہونے کی امید ہی دم توڑ جائے تو اس کی تکمیل میں بہت سے مسائل جنم لیتے ہیں جس کے اثرات منفی انداز سے پورے معاشرے پر پڑتے ہیں ۔اس لیے وہ خالق حقیقی سے اُس امید کے ہونے کے لیے دُعا گو ہیں ۔

پھلا پھولا رہے یا رب چمن میری امیدوں کا
جگر کا خون دے دے کر یہ بوٹے میں نے پالے ہیں

(بانگِ درا)

اقبال کی غزل میں پیغام و اصلاح پوشیدہ ہے لیکن وہ پیغام کسی تھکے ہارے واعظ یا سطحی شاعر کا نہیں ہے بلکہ اس بلند عزم و ہمت انسان کا ہے جو ہر حالت میں اپنی تہذیب کو زندہ رکھنا چاہتا ہے ۔ جو فرد سے اجتماع کا تعلق اور اجتماع میں فرد کی اہمیت کو ناگزیر سمجھتا ہے ۔

مجھے روکے گا تو اے نا خدا کیا غرق ہونے سے
کہ جن کو ڈوبنا ہو ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں

(بانگِ درا)

اقبال فعالیت کے علمبردار ہیں اور معاشرے کے جمود کو موت قرار دیتے ہیں ۔

یہ بتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں
نہ ادائے کافرانہ ، نہ تراشِ آزرانہ

(بالِ جبرئیل)

اقبال فلسفہ عظمتِ انسان کو معاشرے پر منطبق کرتے ہوئے معاشرے کے مسائل کا ادراک رکھتے ہیں اور فعالیت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں ۔

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے

(بالِ جبرئیل)

بالِ جبرئیل اقبال کی غزل گوئی کا نقطہ عروج ہے جہاں اقبال بیک وقت شاعر، فلسفی، اور قوم کے نبض شناس کی حیثیت سے موجود ہیں۔

خرد کے پاس نظر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

گراں بہا ہے تو حفظِ خودی سے ہے ورنہ
گُہر میں آب، گُہر کے سوا کچھ اور نہیں

(بالِ جبرئیل)

اقبال معاشرے کی تفہیم کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اور کسی طور بھی انسان کی حرمت کو پائمالی سے بچانے کے حق میں ہیں کیونکہ خود اعتمادی کا فقدان عزتِ نفس کو مجروح کرتا ہے اور جب کوئی معاشرہ اپنی عزت نفس کو بحال نہ کر سکے تو سوائے عُزلت اُس معاشرے کے نصیب میں کچھ اور نہیں ہوتا۔

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

(بالِ جبرئیل)

اقبال معاشرے کی از سرِ نو تشکیل کے لیے موجود افراد پر یقین رکھتے ہیں ان کی نگاہ میں ہر زوال پذیر معاشرے میں ایسے افراد بھی موجود ہوتے ہیں جو منظرنامے کو تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اقبال مسلمانوں میں ایسے لوگوں پر اعتماد تھا جو کہ اُس منظرنامے کو تبدیل کرنے کی یکسر طاقت رکھتے تھے۔

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

(بالِ جبرئیل)

اقبال کسی طور بھی معاشرے کو غیر فعال نہیں دیکھنا چاہتے انکی نگاہ میں تحرک آزادی کے مترادف ہے اور غیر فعالیت غلامی کی علامت

میسر آتی ہے فرصت فقط غلاموں کو
نہیں ہے بندہ حُر کے لیے جہاں میں فراغ

(بالِ جبرئیل)

اقبال معاشرے میں یکسانیت کے قائل ہیں وہ افراد کو طبقات میں منقسم کرنے کی بجائے ملی وقومی شعور کی بیداری پر زیادہ زور دیتے ہیں۔

ٹھہر سکا نہ ہوائے چمن میں خیمہ گُل
یہی ہے فصلِ بہاری! یہی ہے بادِ مُراد

(بالِ جبرئیل)

اقبال کے بعد جس شاعر نے زمانے کے سیاسی وسماجی صورتحال کو اپنی شاعری میں بیان کیا ہے وہ مولانا حسرت موہانی (۱۸۷۸ء۔۱۹۵۱ء) ہیں۔حسرت موہانی کو رئیس المتغزلین کہا جاتا ہے۔وہ غزل کی روایت کے نہایت اہم غزل گو کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔حسرت موہانی کی بیک وقت ایک شاعر، صحافی، اور ایک سیاسی لیڈر تھے۔ان کی شاعری بیسویں صدی میں غزل کی مکمل روایت کے لفظی، استعاراتی، تشبیہاتی قافلے کے ساتھ جدیدیت کی منزل کی طرف اس پُرشکوہ انداز میں گامزن ہے کہ نہ اسے اپنی کہنہ اقدار پر کہی حیرانی ہے اور نہ ہی نئے معاشرے میں قدم رکھنے کا خوف گوپی چند نارنگ کہتے ہیں:

''حسرت موہانی نے اس صدی کے کروٹ بدلتے ہی اُردو غزل میں تہذیب، عاشقی کو جس طرح زندہ کیا اور عشق ومحبت کو جس فطری معصومیت اور راحت و فراغت کے ساتھ بیان کیا، نیز ان کی عشقیہ شاعری میں جو ارضی وجسمانی کیفیت ملتی ہے اور اس کا اظہار جس شائستگی، لطافت اور تغزل کے رچاؤ اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ ہوا ہے، وہ حسرت ہی کا حصہ ہے''۔ ۶۲

معاشرے سے ان کی وابستگی بہت گہری تھی جس کا اظہار ان کی شاعری میں ملتا ہے۔انہوں نے سیاسی وجوہات کی بناء پر زندگی میں قید وبند کی صعوبتوں کو برداشت کیا، مگر اپنے سخن سے اظہار کی کمی نہ آنے دی۔

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
یک طُرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

(دیوانِ حسرت)

حسرت موہانی زمانی کیفیات کے شاعر ہیں۔ان کی شاعری کا دائرہ فرد سے اجتماع کی طرف بڑھتا ہے

۔وہ خیال سے اندازِ بیان تک کا سفر روایت اور شخصی عناصر کے ساتھ کرتے ہیں۔

کٹ گیا قید میں ماہ رمضاں بھی حسرتؔ
گرچہ سامانِ سحر کا تھا نہ افطاری کا

(دیوانِ حسرت)

حسرت کی شاعری میں محبت اپنے کائناتی انداز میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔وہ بلا امتیاز محبت بانٹنے پر یقین رکھتے ہیں۔حسرت کی شاعری میں عصری شعور سے آگہی اور اظہار برابر موجود ہے۔

اچھا ہے اہلِ جور کیے جائیں سختیاں
پھیلے گی یونہی شورشِ حب ِ وطن تمام

(دیوانِ حسرت)

حسرت معاشرے کے عکاس شاعر ہیں وہ جو کچھ دیکھتے ہیں اس کو تخلیق کے لبادے میں اپنے انداز میں سپردِ قرطاس کر دیتے ہیں۔حسرتؔ کے ہاں معاشرتی حالات کا اظہار واضح انداز میں ہے ان کی سیاسی وسعتِ نظری کا اندازہ درج ذیل اشعار سے ہوتا ہے

ہدایت کا زمانہ تشنہ تھا اہل ِ سویت نے
دکھائی سب کو راہِ حریت بے خوفِ دیں ہو کر

(دیوانِ حسرت)

دولتِ ہندوستاں قبضہ اغیار میں
بے عدد و بے حساب،دیکھئے کب تک رہے

(دیوانِ حسرت)

حسرت کی غزل میں نظریاتی پختگی کا اظہار بھی ملتا ہے۔ان کے ہاں سرمایادارانہ نظام کی مخالفت کے واضح اشعار موجود ہیں جس سے ان کے نظریوں اور عصری آگہی کا پتہ چلتا ہے حسرتؔ نے غزل میں معاشرتی رجحانات، رویوں کے ساتھ ساتھ سیاسی صورتحال کے حوالے سے بھی کھُل کر اظہار کیا اور نہ صرف اظہار کیا بلکہ اشتراکی نظام کی حمایت کر کے اُس وقت موجود نظام کا متبادل بھی فراہم کر دیا۔

دستور کے اصول مسلم ٹھہر چکے
شاہی بھی رام غلبہ مجبور ہو چکی

(دیوانِ حسرت)

سرمایہ دار خوف سے لرزاں ہیں ، کیوں نہ ہوں
معلوم سب کو قوتِ مزدور ہو چکی

(دیوانِ حسرت)

نہ سرمایہ داروں کی نخوت رہے گی
نہ حکام کا جورِ بے جا رہے گا

(دیوانِ حسرت)

ہم قول کے صادق ہیں اگر جان بھی جاتی
واللہ کہ ہم خدمتِ انگریز نہ کرتے

(دیوانِ حسرت)

فیضؔ عصری حسیت کے حوالے سے ایک توانا آواز ہیں فیض احمد فیض (۱۹۱۱ء۔۱۹۸۱ء) جدید رویوں کو قبول کرنے والا شاعر ہے۔ان کی شاعری میں ہمیں معاشرے کی کراہتی ہوئی تصویر نظر آتی ہے۔فیض نے ترقی پسند نظریات کی نہ صرف بنیاد رکھی بلکہ انہیں تا دمِ آخر اپنائے رکھا۔فیض کی شاعری عصری حسیت سے بھرپور شاعری ہے۔فیض کا لہجہ تہذیبی ، ثقافتی عناصر سے تشکیل پاتا ہے جس میں عصری شعور، انسان دوستی ، سیاسی شعور، روشن خیالی کا اظہار ہمیں ملتا ہے۔فیض کی غزل میں ان کا نظریہ ہمیں واضح انداز میں ملتا ہے فیض ترقی پسند تحریک کے روحِ رواں تھے اور اس زمانے میں معاشرہ بدحالی کا شکار بھی تھا جس کا احساس فیض کی مجموعی شاعری میں موجود ہے فیض کی غزل میں استعارہ کو اہمیت حاصل ہے فیض لفظ کی معنویت کو معاشرے کے رنگ میں رنگنا خوب جانتے ہیں۔

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے ،اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

گر بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

(زنداں نامہ)

میں موجود کردار موجود معاشرے سے اخذ شدہ ہیں وہ حقیقت پسند بیانیہ اختیار کرتے ہیں ۔فیض غموں معاشرتی حقائق سے راہِ فرار اختیار نہیں کرتے بلکہ اسے تسلیم کرتے ہیں اور اس کا اظہار بھی کرتے ہیں ۔وہ غم والم میں پریشان ہونے والے یا واویلہ کرنے والے شاعر نہیں بلکہ غم والم کو زندگی کا حصہ سمجھنے والے تخلیق کار ہیں ۔

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

فیض کی غزل میں لفظیات کا روایتی پیرہن تبدیل کیا گیا اور ان کو موجود زمانی لبادے میں بیان کیا گیا ۔فیض غزل میں صیاد سے مراد ہر وہ ظالم ہے جو ظلمتوں کو پھیلانے میں اپنا کردار ادا کرتا ہے ۔

ستون ِ دار پے رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک کہ ستم کی سیاہ رات چلے

در ِ قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے
تو فیض دل میں ستارے اُترنے لگتے ہیں

(دستِ صبا)

فیضؔ کی شاعری میں امید موجود ہے جہاں وہ ظلمتِ شب ،قفس ، دار و رسن جیسی علامات بیان کرتے ہیں وہی یہ بھی کہتے نظر آتے ہیں ۔فیض نے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کی اور اس کے دوراں قلم سے رشتہ بھی برقرار رہا اس لیے فیضؔ کی شاعری میں زنداں ،قفس ، زنجیر جیسے الفاظ کا استعمال ہے مگر ان میں بھی مایوسی کا عنصر نہیں ہے ۔

ہم اہل ِ قفس تنہا بھی نہیں ،ہر روز نسیم ِ اہل ِ وطن
یادوں سے معطر آتی ہے، اشکوں سے منور جاتی ہے

(زنداں نامہ)

دل نا امید تو نہیں ، ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

(زنداں نامہ)

صبا نے پھر در ِ زنداں پہ آ کے دستک دی
سحر قریب ہے دل سے کہو نہ گھبرائے

(دستِ صبا)

فیض کی شاعری کا منظر نامہ ان کی علامتوں میں پنہاں ہے ۔ وہ لطیف لفظوں میں کٹھور معنویت کو سمو دیتے ہیں۔

قفس اداس ہے یارو صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے

(زنداں نامہ)

فیض کی غزل معاشرے کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے گو کہ انہوں نے باقاعدہ غزل گوئی نہیں کی مگر جتنی غزلیں کہی ہیں وہ تخلیق کار کی عصری آگہی کی عکاس ہیں ۔

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

فیضؔ کی شاعری ان کے عمیق مشاہدے کا نتیجہ ہے اس بات کا اندازہ ان کی شاعری کے مطالعے سے ارتقائی منازل کا پتہ معلوم کر کے لگایا جا سکتا ہے ۔فیضؔ جیسا بڑا دماغ ہر آن میں اپنی فکر کو متحرک رکھتا ہے ۔وہ مخلوق کے حق میں خالق سے سوالات کرنے سے نہیں گھبراتا وہ عوام کی بنیادی حقوق تک رسائی کا حامی ہے اور اس کے لیے وعدہ محشر کا انتظار اس کے لیے بہت تکلیف دہ عمل ہے۔

مٹ جائے گی مخلوق تو انصاف کرو گے
منصف ہو تو اب حشر اُٹھا کیوں نہیں دیتے

پیمانِ جنوں ہاتھوں کو شرمائے گا کب تک
دل والو ، گریباں کا پتہ کیوں نہیں دیتے

(دستِ تہِ سنگ)

اپنے دور کی معاشرتی پابندیوں کا اظہار فیض کے ہاں بہت زیادہ ملتا ہے ۔مگر ان اظہاریوں میں امید باقی ہے کہیں بھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ تخلیق کار پر قنوطی پر چھائی موجود ہے بلکہ ہر لحہ نئی امید اور نئی راہ کی جانب پیش قدمی فیض کی شاعری میں ملتی ہے۔فیض کے غزل میں انقلابی رنگ موجود ہے جس میں وہ مقاصد کے حصول پر زور دیتے ہیں اور معاشرے میں تبدیلی کے خواہاں ہیں انکا لہجہ توانا اور پُر امید ہے وہ کسی رکاوٹ ، پابندی سے نہیں کتراتے بلکہ ہر رکاوٹ کا متبادل حل موجود رکھتے ہیں جو کہ ان کے غور وفکر ،تدبر و تعقل ،معاشرتی وابستگی کا پتہ دیتا ہے۔

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو دی ہیں انگلیاں میں نے

فیض کی غزل حریتِ فکر اور اظہار کی جرات کی حامل ہے۔ وہ ہر آنے والی رات کے بعد نئے سورج کے امیدوار نظر آتے ہیں۔

خونِ عشاق سے جام بھرنے لگے، دل سلگنے لگے، داغ جلنے لگے
محفلِ درد پھر رنگ پر آ گئی ،پھر شبِ آرزو پر نکھار آ گیا

(دستِ تہِ سنگ)

فیض آواز ہر دور کی آواز ہے فیض کا جذبہ کبھی ماند نہیں پڑتا بلکہ ہر آن جواں رہتا ہے:

''فیض کے اندر یہ سلگتی ہوئی آگ کبھی بھی ان کے لب و لہجہ کے عام انداز (یعنی نرم گوئی) کے سبب ہلکی ضرور پڑ جاتی ہے۔ لیکن ایسا ان کے ہاں کہیں نہیں ہوتا کہاس کے سرد پڑنے کا احساس ہونے لگتا ہو۔ اس پہلو سے فیض کے کلام کا مطالعہ ہمیں اس بڑی حقیقت کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ وہ جدال و قتال کے لب و لہجہ کی بجائے تبدیلی کے عمل کو ایسے انقلاب آفرینی کا عمل سمجھتے ہیں جو جذبات سے زیادہ ذہنی اور سیاست سے زیادہ عقلی اور شعوری تربیت کے ذریعہ گہرائی اور گیرائی کے ساتھ معاشرہ کو منقلب کر سکے۔ لیکن اس کے باوجود ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ سیاسی انقلاب کو رد کرتے ہوں۔ چنانچہ فیض کی انقلابیت کو سمجھنے کے لیے یہ پہلو بھی اہم ہے کہ فیض جہاں اپنے وطن اور معاشرہ میں فرد اور اجتماع کے لیے سیاسی انقلاب کے ساتھ ساتھ ہمہ جہت سماجی انقلاب بھی دیکھنا چاہتے ہیں''۔ ۶۳

مندرجہ بالا اقتباس سے فیض کی اپنے سماج کے بارے میں فکری وسعت کا اندازہ بخوبی لاگایا جا سکتا ہے اور بطور اجتماع ایک تخلیق کار ہمیشہ اپنے سماج اور عوام کے مسائل کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اردو شاعری کو تقریبا ہر دور میں ایک ایسا شاعر میسر رہا ہے جس کے آواز معاشرے کی عکاس بن جاتی ہے۔

شرحِ بے دردی حالات نہ ہونے پائی
اب کے دل کی بھی مدارات نہ ہونے پائی

(سرِ وادیِ سینا)

جہاں جہاں بھی صاحبِ شعور موجود ہیں وہ اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ اقبال کے بعد بلا شبہ فیض ہی وہ شاعر ہے جس کے کلام میں فرد اور معاشرے کا تعلق مزید گہرا نظر آتا ہے۔ فیض نے اپنی شاعری میں 'آج' اور 'کل' کو بہت معنی خیز انداز میں بیان کیا ہے جس سے ایسی ذو معنویت پیدا ہوتی ہے جو معاشرتی اکھاڑ پچھاڑ کا بھی پتہ دیتی ہے اور امید کی سرشاری بھی وجود میں لاتی ہے۔

مری جان، آج کا غم نہ کر کہ نہ جانے کاتبِ وقت نے
کسی اپنے کل میں بھی بھول کر، کہیں لکھ رکھی ہوں مسرتیں

(مرے دل مرے مسافر)

فیض نے اپنی شاعری میں اپنے نظریات کو فروغ دیا اور جس استقامت کا ثبوت دیا اس کی بدولت مظلوم انسان کی بات جہاں ہوگی، ظلم و استبداد کے خلاف جب بھی آواز بلند کی جائے گی تو فیض کی آواز کو راہنما کی حیثیت حاصل ہوگی۔

فیض آتے ہیں رہِ عشق میں جو سخت مقام
آنے والوں سے کہو ہم تو گزر جائیں گے

(غبارِ ایام)

صحرا پہ لگے پہرے اور قفل پڑے بن کر
اب شہر بدر ہو کر دیوانہ کدھر جائے

(غبارِ ایام)

فیض معاشرے سے کٹ کر تخیل کی دنیا میں ڈوبنے والا شاعر نہیں ہے وہ کسی الہامی کیفیت کا انتظار نہیں کرتا بلکہ موجود زمانی کیفیتوں کو بیان کے لیے ضروری سمجھتا ہے۔

فیض کے ہاں تعین ذات کا کلیہ پیچدہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک مقام پر ٹھہر کر سوچنے والے تخلیق کار نہیں پھر چاہے قفس ہو یا زنداں کی تنہائی یا تختہ دار تکمیلِ مقصد کے لیے ہر چیز کو خندہ پیشانی سے قبول کرتے ہیں۔

مقامِ فیضؔ کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

(زنداں نامہ)

فیض جدید عصری حسیت کے شاعر ہیں وہ اپنی فکر کے ساتھ وفادار ہیں جس کا ثبوت انکا اظہار ہے

۔فیض کی شاعری میں انسانی اقدار کی سر بلندی کا بیان موجود ہے ۔وہ فرد کے معاشرے میں یکساں کردار کے خواہش مند ہیں ۔عصری شعور کے حوالے سے احمد ندیم قاسمی (۱۹۱۶ء۔۲۰۰۶ء) کا نام بھی نمایاں طور پر سامنے آتا ہے ۔احمد ندیم قاسمی کی شخصیت متنوع الجہت ہے وہ بیک وقت کالم نگار، افسانہ نگار، نظم نگار اور اچھے غزل گو ہیں۔ ہر مقام پر وہ اپنی شخصیت کا اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں ۔ہم یہاں صرف ندیمؔ کی غزل گوئی کے حوالے سے بات کریں گے۔ ندیمؔ کی غزل میں رویوں ، رجحانوں کی آگہی موجود ہے۔ ندیم ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے اور اس کا اظہار ان کی تخلیق میں موجود بھی ہے۔ ندیم کی غزل فکری ،تہذیبی روایت کی آئینہ دار ہے وہ اپنی بات کہنے میں تامل سے کام نہیں لیتے بلکہ پُرزور انداز میں بیان کرتے ہیں ۔وہ موجود رویوں سے واقف بھی ہیں اور اس کا اظہار بھی کرتے ہیں ۔مولونا عبدالمجید سالک اس حوالے سے کہتے ہیں :

> ''ندیمؔ نے ہماری شاعری میں گراں بہا اضافہ کیا ہے ۔اس نے اظہار کے کئی نئے راستے دکھائے ہیں ، وہ وزن ، بحر اور قافیہ ردیف کے معاملے میں بھی صرف اس قدر تجاوز یا انحراف کا روادار ہے ، جو ہماری شاعری کے مزاج کے مطابق ہو، وہ الفاظ کے انتخاب میں بے حد محتاط ہے ، وہ ان کی موسیقی کو بھی سمجھتا ہے اور بعض اوقات ان میں ایسا امتیاز کرتا ہے کہ پُرانے شعراء منہ تکتے رہ جاتے ہیں اور انہیں انکار و اعراض کی جرات نہیں ہوتی ''۔ ۶۴

ندیمؔ کی غزل میں رجحانات اور رویوں کا تنوع ملتا ہے ۔ ندیمؔ ہر اس فکر ،عمل کی پیروی کرتا ہے جس میں افراد معاشرہ کے لیے بھلائی ہو کیوں کہ وہ تنہائی کی حقیقت سے آگاہ ہے ۔ندیمؔ منزل کے لیے منظّم قافلے کی بات کرتے دکھائی دیتے ہیں اور اس کے لیے وہ راہنما کے حوالے سے فکر مندی کا شکار ہیں کیوں کہ ندیم کے زمانی حالات میں قیادت کا فقدان ہی سب سے بڑا مسئلہ تھا وہ کہتے ہیں۔

صرف اتنا ہے کہ رستے سے شناسائی نہیں
یوں تو سب کچھ ہے میرے قافلہ سالار کے پاس

ندیمؔ کی غزل میں معاشرتی حالات پر طنز کی کاٹ موجود ہے۔

رہنماؤں سے بس اتنا سا گلہ ہے مجھ کو
ان کے ہونٹوں پہ جو باتیں ہیں ،وہ ذہنوں میں نہیں

ندیمؔ اس حقیقت سے بھی آگاہ ہیں کہ قدر نعمت ہمیشہ زوال نعمت کے بعد ہی ہوتا ہے

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہلِ وطن
یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

ندیم کی غزل کا ستعاراتی نظام نئے رجحانات کا عکاس ہے وہ کلام کے لوازمات سے معنوی دنیا بناتے ہیں۔

زندگی شمع کی مانند جلاتا ہوں ندیمؔ
بجھ تو جاوں گا مگر صُبح تو کر جاؤں گا

ندیم کی شاعری میں زمانی تبدیلیوں کا تذکرہ موجود ہے۔ان کے زمانے میں ایسے حالات موجود تھے جن میں فکری آزادی پر قدغنیں لگائی جا چکی تھیں۔جس کا برملا اظہار اس کی شاعری میں بھی موجود ہے۔

پہرے بیٹھے ہیں قفس پر ،کہ صیاد کو ہے وہم
پر شکستوں کو بھی اک ربط ہے پرواز کے ساتھ

ندیم کی غزل میں امید موجود ہے وہ ظلمتِ شب کے ہوتے ہوئے طلوعِ آفتاب پر زیادہ یقین رکھتے ہیں۔

سورج کو نکلنا ہے سو نکلے گا دوبارہ
اب دیکھئے کب ڈوبتا ہے صبح کا تارہ

ندیمؔ کی غزل میں نظریے کی وابستگی کا پیغام موجود ہے اور وہ اس کے لیے کسی حد تک جانے کے لیے تیار نظر آتے ہیں

جنت ملی جھوٹوں کو اگر جھوٹ کے بدلے
سچوں کو سزا میں ہے جہنم بھی گوارا

ندیم کی غزلوں میں سورج آگہی ،امن،سکون،روشنی کا استعارہ ہے وہ سورج کو غروب ہوتا نہیں دیکھنا چاہتے۔

جی چاہتا ہے فلک پہ جاؤں
سورج کو غروب سے بچاؤں

ندیمؔ کی شاعری میں سیاسی اقدار کے حوالے سے واضح اشارے موجود ہیں وہ جمہوریت کے قائل ہیں وہ عوامی رائے دہی کے ذریعے منتخب افراد کو ہی مسائل کا حل تلاش کرنے کی تلقین کرتے ہیں

شانِ جمہور تو جب ہے کہ ہر انسان کہے
میرا حاکم ، مرا ہر حکم بجا لاتا ہے

ندیمؔ ہر حال میں مجبور ، نادار لوگوں کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اس کے لیے کسی حد تک جانے سے گریز نہیں کرتے

میں شب کے مسافروں کی خاطر
مشعل نہ ملے تو گھر جلاؤں

ندیم نے زمانے کی ناہمواری، معاشرتی گراوٹ کا ذمہ دار ایسے لوگوں کو ٹھہرایا ہے جو اپنے آپ کو ہر دور میں نام نہاد چارہ گر تصور کرتے ہیں۔

اے چارہ گرانِ عصرِ حاضر
فولاد کا دل کہاں سے لاؤں

ندیم زندگی کو آزمائش و امتحان سمجھتے ہیں ان کے نزدیک اگر زندگی انسان کا امتحان ہے تو موت خدا کا امتحان ہے۔

خود کو تو ندیمؔ آزمایا
اب مر کے خدا کو آزماؤں

قاسمی کی شاعری میں عصری حقائق تمام تر تلخیوں کے ساتھ موجود ہیں مگر بیان کردہ حقائق کے ساتھ امید اور تسلی کا عنصر بھی موجود ہے۔

ناصرؔ کاظمی (۱۹۲۵ء۔۱۹۷۲ء) نے نمایاں انداز میں اپنی شاعری میں اپنے زمانے کی عکاسی کی ہے اور آنے والے نظریات و تصورات کو قبول کیا ہے۔ ناصر کاظمی کی شاعری میں سماجی شعور اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ ناصر کاظمی کی آواز اپنے ہمعصروں میں سب سے منفرد آواز ہے یہ آواز ایک پُرسوز ، دردِ دل رکھنے والے شخص کی آواز ہے جو معاشرے میں کرب ناک صورتحال کو دیکھ کر منہ نہیں موڑتا بلکہ اس پر غم زدہ ہوتا ہے اور اس کا اظہار کرتا ہے تا کہ دوسرے لوگ بھی اس غم کو سمجھیں۔ ناصر کا شمار ایسے شاعروں میں ہوتا ہے جنہوں نے فرد کے ذریعے سماج سے رشتہ قائم رکھا۔ ناصر کاظمی کی شاعری کے کینوس پر معاشرے کے رنگ نمایاں نظر آتے ہیں۔

ناصرؔ کے حوالے سے ناقدینِ ادب کا کہنا ہے کہ انہوں نے میرؔ پرستی کی ہے۔ یہ بیان بھی کسی حد تک

درست ہے مگر جس شخص کے سامنے معاشرہ خاک وخون میں غلطاں ہو، تہذیب رو بہ زوال ہو، فرد حشرات سے بھی کم تر سمجھے جائیں ایسے میں کوئی 'بے دل' ہی ایسے ماحول سے روگردانی کرسکتا ہے، شاعر تو نہیں کرسکتا۔ تقسیم کے بعد جس طرح سماجی تبدیلی رونما ہوئی اور فسادات نے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لیا اس کا اظہار وعکس ہمیں ناصر کی شاعری میں نظر آتا ہے۔

او میرے مصروف خدا
اپنی دنیا دیکھ ذرا

اتنی خلقت کے ہوتے
شہروں میں ہے سناٹا

جھونپڑی والوں کی تقدیر
بجھا بجھا سا ایک دیا

(برگِ نے)

ناصؔر کے ہاں جذبہ غم کی شدت سے مزید زور آور ہو جاتا ہے جس سے کلام کی تاثیر میں مزید اضافہ ہوتا ہے

بہاریں لے کے آئے تھے جہاں تم
وہ گھر سنسان جنگل ہو گئے ہیں

کہاں تک تاب لائے ناتواں دل
کہ اب صدمے مسلسل ہو گئے ہیں

(برگِ نے)

شہر در شہر گھر جلائے گئے
یوں بھی جشنِ طرب منائے گئے

کیا کہوں کس طرح سرِ بازار
عصمتوں کے دئے بجھائے گئے

(برگِ نے)

ناصرؔ انسانی عظمت سے آگاہ ہیں شاید اسی لیے انھیں ہر انسان پر یقین ہے کہ وہ اپنے اپنے کردار کو بہت اچھے انداز میں نبھا لے گا۔

میں وہ صبرِ صمیم ہوں جس نے
بارِ امانت سر پہ لیا تھا

میں وہ اسمِ عظیم ہوں جس کو
جن و ملک نے سجدہ کیا تھا

(پہلی بارش)

ناصر شاعر و فرد میں فرق نہیں سمجھتے وہ دونوں کو تخلیقی شخص کا مرتبہ دیتے ہیں۔ بس میدانِ تخلیق جدا ہونے کے سبب دونوں اپنے اپنے انداز میں تخلیق کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر خورشید رضوی اس حوالے سے رقمطراز ہیں کہ:

''ان کے ہاں 'تجربے' کی بجائے 'بازیافت' کا اور 'جاننے' کی بجائے 'پہچاننے' کا عمل زیادہ نمایاں ہے جا بجا یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی کیفیت سے پہلی مرتبہ دوچار نہیں ہو رہے بلکہ دوسری مرتبہ اس کے روبرو آ رہے ہیں اور ایک پرانی بھولی ہوئی شے کو دیکھ کر اس کے خدوخال کو شناخت کرنے کے عمل سے گزر رہے ہیں مختصراً یہ کہ ان کے ہاں 'دوسرے جنم' اور 'حافظے کی بازگشت' کی لرزاں لرزاں کیفیات موجود ہیں۔ جو ان کے فن کی امتیازی شان بھی ہیں اور جان بھی''۔ ۶۵

ناصرؔ کے ہاں ہمیں جہاں جذباتی، و احساساتی تبدیلیوں کے نتیجے میں ہونے والی قلبی وارداتوں کے آثار نمایاں ملتے ہیں وہیں ان کے ہاں معاشرے میں سیاسی تبدیلیوں کے نتیجے میں رونما ہونے والے اثرات کا اظہار، حادثات کا کرب بھی واضح ہے۔ ناصر نے اپنی غزل میں تقسیم سے سقوط ڈھاکہ تک اہم عصری تبدیلیوں کو موضوع بنایا ہے۔

منزل نہ ملی تو قافلوں نے
رستوں میں جما لئے ہیں ڈیرے

وہ ساحلوں پہ گانے والے کیا ہوئے
وہ کشتیاں چلانے والے کیا ہوئے

وہ صبح آتے آتے رہ گئی کہاں
جو قافلے تھے آنے والے کیا ہوئے

(دیوان)

جس شاعر نے ہر حوالے سے اپنے اندازِ بیان سے متاثر کیا وہ احمد فراز (۱۹۳۱ء۔ ۲۰۰۸ء) ہیں۔ احمد فراز سماجی رویوں کو اپنے کلام کے ذریعے عام کرنے والا شاعر ہے۔ فراز کی شاعری میں سماج، ثقافت، سیاست، رومان، ترقی پسندی غرض اگر یہ کہا جائے کہ فراز کی شاعری عصری حسیت کو اپنے اندر سمائے ہوئے ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

سب یاروں کے ہوتے سوتے ہم کس سے گلے مل کے روتے
کب گلیاں اپنی گلیاں تھیں کب شہر ہمارا اس دن تھا

(کلیات احمد فراز)

احمد ندیم قاسمی فراز کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

''فراز تو بھرپور زندگی کا شاعر ہے، وہ انسان کے بنیادی جذبوں کے علاوہ اس آشوب کا بھی شاعر ہے جو پوری انسانیت زندگی کو محیط کیے ہوئے ہے۔ اس نے یہاں انسان کی محرومیوں مظلومیتوں اور شکستوں کو اپنی غزل و نظم کا موضوع بنایا ہے، وہیں ظلم و جبر کے عناصر اور امریت و مطلق العنانی پر بھی ٹوٹ ٹوٹ کر برسا ہے۔''[۶۶]

شکیب جلالی (۱۹۳۴ء۔۱۹۶۴ء) شکیب کا شمار جدید غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔ شکیب کی شاعری میں سماجی گھٹن، تنہائی، انتشارِ ذات بنیادی عناصر ہیں۔ شکیب کا لہجہ حقیقت پسندانہ ہے انکا اسلوب کاٹ دار ہے۔

تو نے کہا نہ تھا کہ میں کشتی پہ بوجھ ہوں
آنکھوں کو اب نہ ڈھانپ مجھے ڈوبتا بھی دیکھ

(روشنی اے روشنی)

آ کے پتھر تو مرے صحن میں دو چار گرے
جتنے اس پیڑ کے پھل تھے پسِ دیوار گرے

(روشنی اے روشنی)

مجھ کو گرنا ہے تو میں اپنے ہی قدموں میں گروں
جس طرح سایہ دیوار پہ دیوار گرے

(روشنی اے روشنی)

سوچا تو سلوٹوں سے بھری ہے تمام روح
دیکھو تو اک شکن بھی نہیں ہے لباس میں

(روشنی اے روشنی)

ملبوس خوش نما ہیں مگر جسم کھوکھلے
چھلکے سجے ہوں جیسے پھلوں کی دکان پر

فصیلِ جسم پہ تازہ لہو کے چھینٹے ہیں
حدودِ وقت سے آگے نکل گیا ہے کوئی

(روشنی اے روشنی)

خورشید رضوی (۱۹۴۲ء۔تا حال) خورشید رضوی کی شاعری جہاں غزل کی روایت سے اپنی جڑت کا احساس قائم رکھتی ہے وہیں موجود معاشرتی مسائل کو بھی اپنے حصار میں لیے ہوئے ہے۔خورشید رضوی ہر عہد کے فرد ہیں اور ان کی شاعری ہر عہد کی شاعری ہے۔

آپ کی شاعری تہ دار رمزیت اور دلپذیر اسلوب کے پس منظر میں جو پُر خلوص اور غیر منقسم شخصیت کی جھلک دکھلاتی ہے اس تک پہنچنے کے لیے صرف ایک ہے راستہ ہے اور اس راستی کے نشان دہی خود شاعر نے یوں کی ہے۔

ع: ڈھونڈنا ہے تو مجھے ڈھونڈ سخن میں میرے

یہ جو ننگ تھے یہ جو نام تھے مجھے کھا گئے
یہ خیالِ پختہ جو خام تھے مجھے کھا گئے

میں عمیق تھا کہ پلا ہوا تھا سکوت میں
یہ جو لوگ محوِ کلام تھے مجھے کھا گئے

جو کھلی کھلی تھیں عداوتیں مجھے راس تھیں
یہ جو زہر خند سلام تھے مجھے کھا گئے

(شاخِ تنہا)

دو حرف تسلی کے جس نے بھی کہے اس کو
افسانہ سنا ڈالا تصویر دکھا ڈالی

(شاخِ تنہا)

یہ بات طے ہے کہ ادب معاشرے کی نبض ہے اور ادیب بلا شبہ معاشرے کا نباض ہے۔ ایک تخلیق کار جس عہد میں سانس لے رہا ہوتا ہے اس دور کی سیاسی، سماجی فضا اس پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ایسا ممکن نہیں کہ وہ اپنے ماحول سے بے خبر ہو کر ادب تخلیق کرتا رہے اگر ایک ادیب اس انداز سے ادب کی آبیاری کر رہا ہے تو محض لفظی شعبدہ بازی تو ہو سکتی ہے ایک بلند و پایہ ادب نہیں ہو سکتا کیوں کہ ماحول سے لاتعلق رہتے ہوئے لکھا گیا ادب تاثیری رنگ سے محروم ہوتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ادیب حساس طبعیت کا مالک ہوتا ہے۔ ادیب کو حساس اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے سماج سے جڑے ہوئے ہر فرد کے مسائل کو اپنا مسئلہ سمجھتا ہے جب کہ آفاقی ذہن کا مالک تو مذہبی حدود و قیود اور ارضی طول و عرض کی قید سے ماورا ہو جاتا ہے وہ محض انسان ہی نہیں بلکہ اس دھرتی سے جڑی ہوئی ہر شے کو اپنی شاعری میں سموتا ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ ایک بڑے اور کامیاب تخلیق کار کا یہ نمایاں وصف ہے کہ وہ اپنے عہد کی صحیح معنوں میں تصویر کشی کرے کیوں کہ ادب معاشرے کا عکاس ہوتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ احتشام علی، اُردو نظم میں عصری حسّیت، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵، ص ۱۴

۲۔ عماد الدین ابن کثیر، تفسیر ابن کثیر (جلد پنجم)، مترجم مولانا محمد صاحب جونا گڑھی، شمع بک ایجنسی، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۵۷۲

۳۔ طباطبائی، محمد حسین، نہایۃ الحکمۃ، ترجمہ (نہایۃ فلسفہ)، سید ہادی، قم، ص ۴۷، ۳۷۳

۴۔ قاضی قیصر الاسلام، فلسفے کی جدید نظریات، اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۹۸ء، ۵۴۲

۵۔ العسقلانی، احمد بن علی بن حجر، فتح الباری (شرح صحیح البخاری)، کتاب الادب، باب العاشر حدیث ۵۹۲۷

۶۔ احتشام علی، اُردو نظم میں عصری حسّیت، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵، ص ۱۵

۷۔ قاضی قیصر الاسلام، فلسفے کی جدید نظریات، اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۹۸ء، ۳۴

۸۔ احتشام علی، اُردو نظم میں عصری حسّیت، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵، ۱۷

۹۔ سید احمد، مولوی، فرہنگِ آصفیہ (جلد سوم)، بار ششم، اُردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۴۱

۱۰۔ http://en.wikipedia.org/wiki/politics

۱۱۔ رشید امجد، ڈاکٹر، میرا جی شخصیت اور فن، نقش گر پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۰۶ء، ص ۳۰۰

۱۲۔ مجیب احمد، پروفیسر، تاریخ فلسفہ سیاسیات، ترقی اردو، نئی دہلی، ۱۹۸۲ء، ص ۲۹

۱۳۔ فوزیہ یاسمین، اُردو نظموں میں سیاسی رجحانات کی جھلک، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۰۵ء، ص ۱۶

۱۴۔ علی محمد خان، ڈاکٹر، لاہور کا دبستانِ شاعری، نشریات، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۴۵۴

۱۵۔ مجیب احمد، پروفیسر، تاریخ فلسفہ سیاسیات، ترقی اردو، نئی دہلی، ۱۹۸۲ء، ص ۴۴

۱۶۔ طباطبائی، علامہ، المیزان (جلد ۲)، مترجم موسوی ہمدانی، ص ۳۷۲

۱۷۔ http://en.wikipedia.org/wiki/consciousness

۱۸۔ حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز، کشاف تنقیدی اصطلاحات، طبع دوم، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص ۱۸۰، ۱۸۱

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۵

۲۰۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، مباحث (ڈاکٹر سید عبداللہ کے تحقیقی وتنقیدی مضامین)، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۵ء ص ۳۳۴

۲۱۔ سید عابد علی عابد، اصول انتقادِ ادبیات، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۲۸

۲۲۔ مجنوں گورکھپوری، ادب اور زندگی، مکتبہ دانیال، کراچی، طبع سوم، ۲۰۰۸ء، ص ۴۹

۲۳۔ اُردو لغت تاریخی اصول پر (جلد چہارم)، ترقی اُردو بورڈ، کراچی، ۱۹۸۲ء، ص ۸۴۵

۲۴۔ محمد صدیق، قریشی، کشاف اصطلاحاتِ تاریخ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان، طبع اول، ۱۹۸۸ء، ص ۱۵۷

۲۵۔ www.urdumajlis.net/threads

۲۶۔ www.urdumajlis.net/threads

۲۷۔ علی عباس جلالپوری، مقالاتِ جلالپوری، تخلیقات، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۱۹۱

۲۸۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ فہمی، تاریخ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۱۷

۲۹۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ایلیٹ کے مضامین، ایجوکیشنل ہاوس دہلی، س۔ن، ص ۱۸۵

۳۰۔ علی عباس جلالپوری، مقالاتِ جلالپوری، تخلیقات، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۷۸

۳۱۔ عزیز احمد، پروفیسر، ہندو پاک میں اسلامی کلچر، مترجم، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۹۱ء، ص ۳

۳۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ایلیٹ کے مضامین، ایجوکیشنل ہاوس دہلی، س۔ن، ص ۱۸۵

۳۳۔ ناصر عباس نیّر، ڈاکٹر، غالبؔ ہمارا لازمانی معاصر، مشمولہ: اجراء (سہ ماہی)، مدیر، احسن سلیم، شمارہ نمبر ۱۱ (جولائی تا ستمبر)، BEYOUND TIME PUBLICATIONS، کراچی، ۲۰۱۲ء، ص ۲۲۰

۳۴۔ حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع دوم، ۱۹۸۵ء ص ۵۴، ۵۵

۳۵۔ سبطِ حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، مکتبہ دانیال، کراچی، بار ہشتم، ۱۹۸۹ء، ص ۱۴، ۱۳

۳۶۔ تہذیب وثقافت /www.theajmals.com/blog

۳۷۔ www.tamu.edu/faculty/culture

۳۸۔ سبطِ حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، مکتبہ دانیال، کراچی، بار ہشتم، ۱۹۸۹ء، ص ۱۸، ۱۷

۳۹۔ محمد علی صدیقی، توازن، عصر نو، کراچی، ۱۹۷۶ء اکتوبر، ص ۹۱

۴۰۔ ابوالاعجاز، حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، جولائی ۱۹۸۵ء، ص ۹۰

۴۱۔ http://ur.wikipedia.org

۴۲۔ انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، نیلاب پرنٹرز، راولپنڈی، ۲۰۱۵ء، ص ۱۱۰

۴۳۔ علی عباس جلالپوری، روحِ عصر، تخلیقات، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۹، ۸

۴۴۔ عابد حسن، منٹو، نقطہ نظر، ملٹی میڈیا افیئرز، اشاعتِ دوم، ۲۰۰۳ء، ص ۸، ۹

۴۵۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ادب میں عصریت کا مفہوم، مشمولہ: پاکستانی ادب (حصہ نثر)، مرتبین، ڈاکٹر رشید امجد، ڈاکٹر سلیم اختر، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء، ص ۹۰

۴۶۔ محمد ہادی حسین، شاعری اور تخیل، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۵ء، ۸۱ تا ۷۹

۴۷۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، تصوراتِ عشق وخرد اقبال کی نظر میں، اقبال اکادمی، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۸۶، ۸۵

۴۸۔ ایضاً

۴۹۔ سُنبل نگار، ڈاکٹر، اُردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ، شہزاد پرنٹرز، لاہور، س۔ن، ص ۸۸

۵۰۔ وہاب اشرفی، ولؔی کا تہذیبی ورثہ اور ان کی شاعری، مشمولہ: ولؔی دکنی تصوف، انسانیت اور محبت کا شاعر، مرتبہ گوپی چند نارنگ، ساہتیہ اکادمی، ۲۰۰۵ء، ص ۴۵، ۴۴

۵۱۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، نقدِ میرؔ، آئینہ ادب، لاہور، س۔ن، ۲۰۲

۵۲۔ افضال حسین، قاضی، میرؔ کی شعری لسانیات، نشاط پریس، یو۔پی، ۱۹۸۳ء، ص ۸۳، ۸۲

۵۳۔ http://ur.wikipedia.org

۵۴۔ شمیم حنفی، غالبؔ کی تخلیقی حسّیت، غالبؔ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۰۵ء، ص ۱۰۰

۵۵۔ شان الحق حقی، آئینہ افکارِ غالبؔ (کلامِ غالبؔ پر نئی روشنی)، ادارہ یادگارِ غالبؔ، ۲۰۰۱ء، ص ۶۹

۵۶۔ سید احتشام حسین، پروفیسر، غالبؔ کا تفکر اور اس کا پسِ منظر، مشمولہ: مطالعاتِ کلامِ غالبؔ، انتخاب، حکیم عبدالحمید، غالبؔ اکیڈمی، نئی دلی، ۲۰۱۰ء، ص ۵۹

۵۷۔ شوکت سبزواری، ڈاکٹر، غالبؔ فکر، وفن، کُل پاکستان انجمن ترقی اُردو، س۔ن، ص ۱۷۷

۵۸۔ ظ۔ انصاری، غالبؔ شناسی کے زینے، مشمولہ: مطالعاتِ کلامِ غالبؔ، انتخاب، حکیم عبدالحمید، غالبؔ اکیڈمی، نئی دلی، ۲۰۱۰ء، ص ۲۲۱

۵۹۔ سید وقار عظیم، پروفیسر، اقبالیات کا مطالعہ، مرتبہ، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، اقبال اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۲۲۱، ۲۲۰

۶۰۔ شمس الرحمان فاروقی، اندازِ گفتگو کیا ہے؟، مکتبہ جامعہ، نئی دلی، ۱۹۹۳ء، ص ۱۶، ۱۵

۶۱۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، علامہ اقبال کی شاعری، مشمولہ: اقبال معاصرین کی نظر میں، مرتبہ، سید وقار عظیم، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۲۴۳

۶۲۔ گوپی چند نارنگ، شعر حسرت کی سیاسی جہت نظر ثانی کی ضرورت، مشمولہ: حسرتؔ موہانی ۱۹۸۱ء سیمینار میں پڑھے گئے مقالات، بہار اُردو اکادمی، پٹنہ، ۱۹۸۳ء، ص ۹۷

۶۳۔ عتیق احمد، فیضؔ، عہد اور شاعری، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۱۱۷

۶۴۔ ناہید قاسمی، ندیم کی غزلوں کا تجزیاتی مطالعہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۸۴

۶۵۔ خورشید رضوی، ڈاکٹر، ناصرؔ کاظمی، مشمولہ: تالیف (مضامین)، مصنف ڈاکٹر خورشید رضوی، شہ تاج مطبوعات، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۳۶

۶۶۔ احمد ندیم قاسمی، احمد فراز کی شاعری۔۔ایک مختصر تاثر، مشمولہ: خوابِ گُل پریشان ہے، احمد فراز، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۰۲ء، ص ۱۰

بابِ دوم

خورشید رضوی کی غزل میں سماجی و سیاسی شعور

۱۔ خورشید رضوی کی غزل میں سیاسی شعور

۲۔ خورشید رضوی کی غزل میں سماجی شعور

۱۔ خورشید رضوی کی غزل میں سیاسی شعور:

عام طور پر ادب اور ادبی رویے سیاست سے متاثر ہوتے ہیں ۔ آفاقی ادب اپنے اندر براہ راست سیاست کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے ۔ ادب اور سیاست دونوں ہی انسانی زندگی سے گہری وابستگی رکھتے ہیں اور اس پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں ۔ اگر ایک تخلیق کار شعوری طور پر اپنے عہد اور اس کی سیاست پر نظر رکھتا ہے اور اس کے باہمی ربط کے نتیجے میں منظر عام پر آنے والی کیفیات کو اپنی تخلیقی بنیادوں میں شامل کرتا ہے تو اس کا سیاسی شعور اس کی تخلیق کا نہ صرف حصہ بنتا ہے بلکہ لاشعوری طور پر وہ معاشرے کی سیاسی تاریخ لکھ رہا ہوتا ہے ۔

اُردو غزل کی تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے تو ہمیں اس کے آغاز سے لے کر عہدِ حاضر تک اپنے تخلیق کاروں کی تخلیقات میں سیاسی شعور فی زمانہ موجود نظر آتا ہے ۔ اُردو غزل میں خورشید رضوی کا تعلق ۶۰ء کے عشرے سے ہے ۔ اسی تناظر میں صرف دو دہائیاں قبل پوری دنیا کا منظر نامہ خون میں ڈوبا ہوا ہے ۔ بین الاقوامی سطح پر دوسری جنگِ عظیم جب کہ برصغیر میں تقسیمِ ہندوستان ، ہجرت ، خون خرابے ، لوٹ کھسوٹ وغیرہ جیسے انسانیت سوز واقعات سے معاشرہ تہ بالا ہو چکا تھا ۔ ہندوستان کی آزادی کی دستاویز پر دستخط کا مرحلہ کسی بڑی خون آشامی کی بغیر سیاسی جدوجہد کے نتیجے میں آ گیا تھا ۔ البتہ آزادی کے اعلان کے بعد علاقے میں پھیلنے والے فسادات کی آگ اتنی تیزی کے ساتھ پورے ملک کی جانب لپکی کہ دیکھتے دیکھتے پورا ملک اس آگ کی لپیٹ میں آ گیا ۔ اس خونی دوڑ نے بعد میں تشکیل پانے والے معاشرے پر نہایت خوفناک اثرات مرتب کیے ۔ دونوں جانب سُرخ ہجرت کا ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ جس کا تصور آج کے اس میکانکی دور میں بھی عام انسان سے لے کر خواص تک کو لرزہ براندام کر دیتا ہے ۔

اُجڑی ہوئی گودی لے کر مائیں ، آبرو ریز خواتین ، بھائیوں سے بچھڑی ہوئی بہنیں ، بوڑھی کمر پر رختِ سفر باندھے ہوئے قافلے کا بے بس ، مجبور سالار آہوں اور سسکیوں کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی جنم بھومی کو الوداع کہہ رہے تھے ۔ یہ کسی ایک گھر کی داستان نہیں بلکہ ہر اُس گھر کی داستان ہے جو اس وقت اپنے انتخاب کردہ مُلک کی جانب سفر کر رہے تھے ۔ پورا ملک مقتل بنا ہوا تھا ۔ مگر اپنی آنکھوں میں نئے ملک کا خواب سجائے لوگ گھروں کے گھر کاندھوں پر لادے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے ۔ یہ ایسی مملکت کے خواہاں تھے جہاں ان کے جذبات ، احساسات کی قدر ہو اور انہیں آزادی کے ساتھ سانس لینا نصیب ہو ۔ وہ اپنے اس خواب کی تعبیر دیکھنے کے لیے بے چین تھے ۔ نیا ملک صرف ایک خطہ زمین نہیں تھا بلکہ لاکھوں لوگوں کے خوابوں

کا جہاں تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ جذباتی کیفیت بدلنے لگی تو نئے مسائل منظر عام پر آئے۔ بے گھروں کو اپنے سونے آنگن کی یاد ستانے لگی۔ وطن سے محبت ایک مسلم حقیقت ہے۔ مگر اس تصویر کے دوسرے رُخ کی جانب نگاہ کی جائے تو نئی ریاست کے قیام میں افرادِ معاشرہ کو جو مسائل درپیش تھے وہ کسی سے مخفی نہیں ہیں۔ جو لوگ نئے وارد ہوئے تھے اور مسائل جھیل کر آئے تھے۔ اس نتیجے میں جو ادب تشکیل پایا وہ بھی انہی کیفیات کا عکاس ہے۔ ۱۹۵۵ء تک پورا پاکستانی معاشرہ انتشار کی کیفیت میں غوطہ زن تھا۔ اس کے ساتھ جغرافیائی سطح پر جو خلیج واضح ہو چکی تھی اس کے اثرات لسانی سطح پر بھی اُس وقت کے پاک و ہند میں دیکھے جا سکتے تھے۔ دونوں ممالک میں ادبی رجحانات و رویوں میں بھی واضح تقسیم نظر آ رہی تھی۔ مثال کے طور پر وہ ترقی پسند ادبی رجحانات جو ایک دہائی قبل برصغیر میں مقبول تھے تقسیم کے بعد وہ بھی تقسیم ہو گئے۔ اس دور کے اندر تخلیق ہونے والے ادب میں بھی یہی ہیجانی کیفیات موجود ہیں۔ شعراء کے ہاں داخلی احساسات، ابہام وغیرہ کی کیفیات واضح انداز میں موجود تھیں جس کی ایک وجہ واضح مقصد کا فقدان تھا۔ آزادی کے کے تخلیق ہونے والے ادب کے حوالے سے معین الدین عقیل کہتے ہیں: ''اس دور میں نئے ادب اور ترقی پسند ادب کے خاص خاص موضوعات کی پیش کش کم ہو جاتی ہے۔ مثلاً معاشی اور سیاسی انقلاب کی دعوت پہلے سے کم نظر آتی ہے۔ نئے شعراء شاعری کی قدیم روایات سے زیادہ دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ حالات سے سمجھوتہ اس دور کا غالب رجحان بن جاتا ہے''۔[۱]

گویا آزادی کے بعد کا ادب مقصدیت کے حوالے سے بہت حوصلہ افزاء نہیں تھا۔ اجتماعیت کی جگہ انفرادی رویوں نے لے لی تھی۔ کیونکہ ان کے سامنے نئے معاشرے میں امن و سکون کی فضا کم اور خوف، دہشت، بے یقینی کی فضا زیادہ موجود تھی۔ اس خوف، دہشت کے ملے جلے جذبات و احساسات سے بعد کا معاشرہ تشکیل پایا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر محمد عالم خان لکھتے ہیں:

> ''قیام پاکستان کے محرات اور اسباب کی تاریخی صداقت اپنی جگہ، اس اُکھاڑ پچھاڑ کے نتیجے میں جو خطہ آزاد ہوا اس میں فرد کی صورتحال بُری طرح مسخ ہوئی۔ معاشرتی انتشار، مالی لُوٹ کھسوٹ اور تمدنی ابتری نے فرد کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء کے بعد قائم ہونے والا معاشرہ فرد کی ذہنی، لسانی و نفسیاتی پیچیدگیوں میں اضافہ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ پاکستانی فرد اپنی ذات میں عدم تحفظ کا شکار ہوا۔ وہ خود کو ہجوم میں تنہا محسوس کرنے لگا، ایک سہما ہوا انسان جسے آزادی کی قیمت کو چکانے کے لیے فکری جلاوطنی نصیب ہوئی''۔ [۲]

درج بالا اقتباس سے جہاں تمدنی انتشار کی وضاحت ہوتی ہے وہاں یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ

فکری اعتبار سے فرد سے لے کر گروہ تک صورتحال دگرگوں تھی۔ جس کے واضح اثرات ادب پر موجود ہیں۔ بیسویں صدی کا مکمل منظر نامہ بیشتر اقوام کی جدوجہد سے آراستہ ہے۔ ایک صدی کے پہلے پچاس سالوں میں دو عالمی جنگوں کا ہونا کوئی اتفاقیہ نہیں بلکہ پچھلی صدیوں میں بننے والے حالات کا نتیجہ تھا۔ جب پورا معاشرہ انتشار کا شکار ہو جائے تو تہذیبی اقدار زوال پذیر ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ جس کی وجہ سے افراد میں یاسیت و نا امیدی جنم لیتی ہے۔ جس کا اظہار فنکار اپنے فن پارے کے ذریعے عام لوگوں سے زیادہ واضح انداز میں کرتا ہے۔ جیسا کہ دہلی کے شعرا کے ہاں عہدِ میرؔ وسوداؔ میں نظر آتی ہے۔ بالکل اسی انداز سے برصغیر پاک و ہند میں بھی آزادی کے بعد بالخصوص شعراء میں نا امیدی و یاسیت کی لہر نظر آتی ہے۔

بہت سے شعراء کے ہاں اس کا اظہار تقلیدِ میرؔ کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ معین الدین عقیل لکھتے ہیں: ''یہ رجحان اس وقت محض اثر انگیزی کی ایک کوشش نہیں بلکہ عہد کا تقاضہ تھا۔ اسی رجحان نے بعض نئے شاعروں کی انفرادیت کی تشکیل میں نمایاں حصہ لیا۔''[۳] یعنی معاشرے میں موجود عصری رویوں سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والا گروہ ادیبوں کا تھا۔ نئے غزل گویوں میں جن افراد نے روایت سے الحاق کرتے ہوئے غزل کے لہجے کو نئی چاشنی بخشی ان میں سب سے نمایاں نام ناصر کاظمی، ابنِ انشاء، قتیل شفائی، عزیز حامد مدنی، باقی صدیقی، وغیرہ کے ہیں۔ اس دور میں ایسے شعراء کا بھی ایک گروہ موجود نظر آتا ہے جو مذکورہ بالا شعراء سے نسبتاً قدیم غزل گو ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں نام فیضؔ، جوشؔ، صوفی غلام مصطفیٰ تبسمؔ، احمد ندیم قاسمی، سیماب اکبرآبادی، عبدالحمید عدمؔ، کا ہے جنہوں نے غزل میں خوشگوار اضافے کیے۔ ہر ایک نے اپنی اپنی فکری رسائی کے مطابق جدتِ تخیل سے غزل کو روشناس کرایا۔ لفاظی، مبالغے، ماورائے تخیل باتوں سے غزل کو نجات دلا کر اس میں گہرائی و گیرائی، سادگی و جاذبیت کو پیش کرنیکی کوشش کی گئی۔

اس نئے معاشرے کی تشکیل سے پہلے ترقی پسند ادب کے زیرِ سایہ نظم ہر حوالے سے غزل کو پیچھے چھوڑتی نظر آرہی تھی۔ مگر آزادی کے بعد غزل کا احیاء ہوا اور غزل گو شعراء نے غزل کو دوبارہ قبولِ عام کی سند دلوانے کے لیے کوششیں جاری رکھیں۔ وہ کسی حد تک اس میں کامیاب بھی ہوئے مگر دوسری جانب حلقہ اربابِ ذوق و ترقی پسند تحریک کے لوگوں نے نظم پر زیادہ زور دیا۔ لیکن نئے شعراء نے مزید بہتر انداز میں غزل کو پیش کیا۔

> ''نئے شعراء زندگی کی حقیقتوں سے متصادم ہوئے۔ انہوں نے بعض
> خارجی حقائق مثلاً معاشرت، زندگی، فطرت اور کائنات کے ادراک سے
> اپنے رویہ کو تبدیل کر لیا تھا۔ اس رویے نے غزل کو روایت سے قدرے

انحراف کر کے اپنے خلقی اوصاف دریافت کرنے پر مجبور کیا''۔[۴]

گویا نئے شعراء نے انفرادی کاوشوں کے بل بوتے پر اپنی شناخت بنانے کے ساتھ ساتھ غزل کے خدو خال میں بھی نمایاں تبدیلی کی اور غزل کو معنوی خزانے سے مالا مال کیا۔

آزادی کے بعد موجود معاشرے اور ماحول نے ہر شاعر کو متاثر کیا۔ خورشید رضوی کی غزل پر بھی اس مخصوص دورانیے کے اثرات موجود ہیں۔ خورشید رضوی کی زندگی کے حالات و واقعات کچھ ایسے ہیں، جنہوں نے ان کے ادبی ذوق کی بُنت میں اہم کردار ادا کیا۔ خورشید رضوی کی عمر چار برس تھی جب ان کے والد کا انتقال ہُوا۔ اس کے بعد وہ تنہیال میں قیام پذیر رہے اور پاکستان آنے کے بعد منٹگمری میں رہے۔ پہلی ہجرت انہوں نے امروہہ سے منٹگمری میں کی جہاں انہوں نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ خورشید رضوی اس بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''والد صاحب کی وفات کے بعد میری والدہ مجھے اور میری بہن کو ساتھ لے کر اپنے میکے چلی آئیں اس کے بعد تنہیال میں ہی میری پرورش ہوئی۔ میرے بڑے اور منجھلے ماموں دلی میں ملازمت کرتے تھے۔ وہ تقسیم ملک کے ہنگامے میں ایسے گھرے کہ امروہہ واپس نہ جا سکے اور فسادات میں جان بچاتے ہوئے لاہور اور وہاں سے منٹگمری (اب ساہیوال) آپہنچے۔ بڑے ماموں ریلوے میں ملازم ہوئے۔ اُن کو ریلوے سٹیشن منٹگمری پر ایک کوارٹر مل گیا۔ میری نانی صاحبہ میرے دو چھوٹے ماموں اور چھوٹی خالہ کے ہمراہ امروہہ کی سکونت ترک کر کے نکلیں اور منٹگمری پہنچ کر اُس ریلوے کوارٹر میں آباد ہو گئیں۔ میں بڑی خالہ، خالو میاں اور والدہ کے ہمراہ مزید کچھ عرصہ اپنے تنہیالی مکان ہی میں رہا۔ تا آنکہ بڑے ماموں نے ہم لوگوں کو بھی پاکستان بلوا لیا۔ چھ سات برس کی عمر میں منٹگمری پہنچا''۔ [۵]

خورشید رضوی کے بچپن میں باپ کی وفات، ہجرت کا دُکھ اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ابتر صورتحال نے ان کی زندگی اور شاعری دونوں پر ان مٹ نقوش چھوڑے۔ وہ جلوت میں بیٹھے خلوت کے دھندلکوں میں جھانکتے رہتے ہیں۔

خورشید رضوی ان حالات سے واقف ہیں بلکہ اگر یوں کہا جائے تو بجا ہو گا کہ عینی شاہد ہیں۔ انہوں نے معاشرتی، سماجی حالات کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ انہیں کما حقہ سپرد قرطاس کر کے صحیح معنوں میں اپنے سماجی

اور معاشرتی ماحول کی عکاسی کی ہے۔ نئے پاکستانی معاشرے کی تشکیل نو کے مراحل مکمل طے نہیں ہوئے تھے کہ پہلے ۱۹۶۵ء میں فساد کی نئی لہر نئے وسائلِ حرب کے ساتھ سہمے ہوئے لوگوں کے سروں پر منڈلانے لگی اور امن کے خواب دیکھنے والا انسان، پھولوں کی خوشبوؤں سے معطر ہونے کے خواہاں فرد کو بارود کی زہریلی بُو نے گھیر لیا۔ انسان ایک دوسرے کے خون کا پیاسا نظر آنے لگا۔ تمام معاشرے میں افراد بے سکونی و بے چینی کے زندگی بسر کر رہے تھے۔ جس کا سب سے زیادہ اثر تخلیقی دنیا کے باشندوں پر ہوا۔ جس کی وجہ سے ان کی تحریروں میں حیرت، خوف، تجسس، کے ملے جُلے جذبات کا اظہار نظر آتا ہے۔

خورشید رضوی کی غزل میں ان کے دور کی سیاسی و سماجی صورتحال اور ان کے نتیجے میں معاشرے پر ہونے والے اثرات کا اعلانیہ تذکرہ موجود ہے۔ خورشید رضوی کی آواز ایسی آواز ہے، جس میں معاشرے کے افراد کے لیے ایک امید کی کرن موجود ہے۔ ان کی غزلوں میں مستحکم، معتدل اور انسان دوست معاشرے کی تشکیل کی خواہش پائی جاتی ہے۔ خورشید کے ہاں دیگر افراد کی طرح کھوکھلے نعرے بازی، باغیانہ رویہ موجود نہیں ہے۔ بلکہ ان کے ادبی شعور کی پہچان ان کی بُردباری و سنجیدگی ہے۔ جو ان کو اپنے ہم عصر شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔ لیکن اس سے ہرگز مراد یہ نہیں کہ ان کی شاعری میں احوالِ معاشرہ کا تذکرہ موجود نہیں بلکہ آپ نے اپنے زمانے کی ادبی صورتحال کو نہایت چابکدستی اور فنکارانہ مہارت سے ادبی پیرائے میں قلمبند کیا۔ آپ نے اسی سنجیدگی سے کام لیتے ہوئے تخیلات کے جمِ غفیر میں اپنے تخیل کی امتیازی پہچان بنائی جو آپ کا خاصہ ہے۔

خورشید رضوی ظاہر بین نہیں ہے اس بات کا اندازہ ان کی شاعری سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ خورشید رضوی کا زمانہ یکے بعد دیگرے سیاسی تبدیلیوں کی لپیٹ میں رہا۔ معاشرہ پر ابھی پہلی ہجرت کے نتیجے میں ہونے والے اثرات ختم نہیں ہوئے تھے کہ سقوطِ ڈھاکہ نے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جس کے اثرات پورے معاشرے پر نمایاں طور پر آج بھی موجود ہیں۔ جس کی گونج آج تک سُنی جا سکتی ہے۔ نیز اس معاشرتی تبدیلی کے نتیجے میں وجود میں آنے والی تخلیقات بھی اس بڑی سماجی و سیاسی تبدیلی کے زیرِ اثر تھیں۔ بعد ازاں کی سیاسی و سماجی صورتحال بھی معاشرے کے لیے مستحکم نہیں تھی۔ جس کے اثرات اس دور کی ادبی کاوشوں پر نمایاں ہیں۔

خورشید رضوی اپنے زمانے کی سیاسی و سماجی صورتحال کو چشمِ حقیقی سے دیکھتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کی شاعری پر اپنے دور کے حالات کی چھاپ موجود ہے۔ مگر خورشید کا خاصہ یہ ہے کہ وہ موجود سیاسی رویوں کو اپنی شاعری کا موضوع اس انداز میں نہیں بناتا یا یوں کہہ لیں کہ اس انداز سے نہیں بیان کرتا کہ شاعری زمانے کے

ماحول کی منظوم تشریح بن جائے اور غزل اپنی شعری چاشنی کھو کر شہرِ آشوب لگنے لگے۔ خورشید رضوی بے جا طوالت کے قائل نہیں ہیں وہ زبان کو اس کے صحیح محاسن کے ساتھ استعمال کرنا بخوبی جانتے ہیں۔

غزل کی یہ خوبی رہی ہے کہ ہر دور کے بہترین جمالیاتی احساسات کے نمونے ہمیں اردو غزل میں ملتے ہیں۔ بالکل اسی انداز سے جہاں خارج سے جمالیات کا عنصر غزل کے بیان میں چاشنی کا باعث بنتا ہے۔ اُسی طرح خارج کے رنج آمیز حالات و واقعات سے غزل کا روپ بگڑتا نہیں بلکہ اسے معاشرے کی آواز بناتا ہے۔ خورشید نے اسی بات کو بہتر انداز سے سمجھا اور اس کا اطلاق بھی اپنی غزل پر کیا۔ جس کے نتیجے میں انہیں کامیابی حاصل ہوئی۔

صاحب علم و حکمت جس انداز سے معاشرے کو دیکھتا ہے اور مسائل کا ادراک کرتا ہے عام آدمی اس سے قاصر ہے۔ یہی فرق خورشید کو باقی شعرا سے ممتاز کرتا ہے۔ خورشید سماجی اقدار کے زوال سے واقف ہیں۔

یہ دور وہ ہے کہ بیٹھے رہو چراغ تلے
سبھی کو بزم میں دیکھو مگر دکھائی نہ دو

(شاخِ تنہا)

ہوئے رنگ اور لفظ گردِ سفر
رہا بس تو اک دیدہ نم رہا

(امکان)

بدلے ہوئے بادشاہ اور وُہی تاج و تخت
نام نئے سے نئے اور نگیں ایک سا

(دیریاب)

خورشید رضوی سیاسی صورتحال کو معاشرے کی بہتری کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک حکمران بدلنے کی بجائے نظام بدلنا چاہیئے۔ جب تک نظام میں بہتری نہیں آئے گی تب تک معاشرہ ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہوسکتا۔

خدائے زندہ! پکڑتا ہے تُو تو جلد پکڑ
انہیں کہ جو ترے ہوتے خدا بنے ہوئے ہیں

(دیریاب)

رضوی سماج میں کمزور افراد کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں، جاگیرداروں کے مظالم انسان زندگی کی بے وقعتی پر خدا سے سراپا سوال ہیں۔ مذکورہ بالا شعر میں ظالموں کہ عدل کے دائرے میں لانے کے لیے خواہش موجود ہے۔ جو کہ شاعر کے سیاسی نظریات کی جانب اشارہ کرتی ہے۔

سیاست سماج کا ایک مکمل عملی نظام ہے۔ جس کے دائرہ ریاست کے ہر ادارہ کو اپنی لپیٹ میں لیتا ہے ۔کسی ادارہ کی سالانہ کارکردگی، صورتحال کا جائزہ کے لیے ایک منظّم پالیسی موجود ہے۔لیکن ہمارے معاشرے میں نظام تو موجود ہے لیکن اس کا اطلاق نہیں ہے۔ جو کہ نظام کو جامد کرنے کے ساتھ معاشرے کو بھی جمود کی طرف دھکیلنے لگتا ہے۔

ہمیشہ ایک سی رفتار ،ایک سے شب و روز
کبھی تو چونکیے، یہ آپ کیا بنے ہوئے ہیں

(دیریاب)

خورشید رضوی سماجی بگاڑ میں نام نہاد اہلیانِ جبہ و دستار کو ذمہ دار ٹھہرانے میں کوئی تامل نہیں برتتے۔ بلکہ وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اغلاط کی نشاندہی مستقبل میں فائدہ کا باعث ہوتی ہے۔

یہ عالمانِ عالَمِ ظاہر، یہ کم سواد
کوتاہی عمل کو سمجھتے ہیں اعتقاد

(امکان)

خورشید رضوی کے ہاں کوتاہی عمل ایک جرم کی مانند ہے۔ کیونکہ عمل ہی قوم اور معاشرے کی ترقی کا تعین کرتا ہے۔خورشید قلبی کیفیات کے فقدان کا ذمہ دار بھی ایسے شعلہ بیاں خطیبوں کو سمجھتے ہیں جن کی شعلہ بیانی نے لوگوں کو خدا سے دور کر دیا ہے۔

دریچہ دل کا جو گھر میں خدا کے کھُلتا تھا
اسے فقیہ کے زورِ بیاں نے بند کیا

(امکان)

خورشید رضوی ہر بڑے ادیب کی طرح روز مرہ کی زندگی میں نئے زاویے تلاش کرتے نظر آتے ہیں۔خورشید ہر رو کو اس کے زمانی آئینے میں دیکھتے نظر آتے ہیں۔

سوچو تو ہیں فقیر کو آسانیاں بہت
دنیا میں یہ نصیب کہاں بادشاہ کے

(امکان)

خورشید رضوی معاشرے میں موجود طبقاتی نظام پر تنقید کرتے ہوئے فقیر کو بادشاہ سے بہتر انداز میں زندگی گزارنے والا کہتے ہیں۔خورشید اپنی ذات کے بیان سے ہچکچانے والے شاعر نہیں ہیں۔ بلکہ وہ بیانِ ذات کی ترغیب دینے والوں میں سے ہیں کیونکہ جب تک استخراجِ اظہار نہیں ہوگا تب تک اس میں بے چینی و اضطرابی کی کیفیت برقرار رہتی ہے۔ جہاں وہ اوصاف وکمالات کے بیان کرتے ہیں وہیں اپنی زندگی کے ایسے لمحوں کا ذکر بھی کرتے ہیں جب 'شوریدہ سری' ہی نمایاں 'وصف' تھی۔

جیسی شوریدہ سری مجھ میں رہی اک عمر
ویسی شوریدہ سری جوئے کہستاں میں نہ تھی

(امکان)

آ پہنچا ہے وہ وقت کہ خورشید سرِ بزم
جو دل میں چھپا رکھا ہے وہ راز نکالے

(امکان)

معاشرے میں موجود بدانتظامی و انتشار افرادِ معاشرہ کے فکری رویوں کو یکسر تبدیل کر دیتا ہے۔ پُر سکون معاشرے ہی ایجادات کے میدان میں جولانیاں دکھاتے ہیں۔ جب کہ بے سکونی کی کیفیت میں مبتلا معاشرے نا امیدی وقنوطیت کی تصویر بن جاتے ہیں۔ایسے حالات میں فنکار کا حق ہے کہ وہ امید کی ایسی فضا قائم کرے کہ اپنے ساتھ پورے معاشرے کی اصلاح ممکن ہو سکے۔خورشید رضوی قنوطی افکار کے مالک نہیں ہیں وہ معاشرے پر چھائی قنوطیت میں امید کی کرن دیکھتے بھی ہیں اور دکھاتے بھی ہیں۔

دلوں میں حیثیتِ رفتگاں بدل جائے
اگر یہ وہمِ زمان و مکاں بدل جائے

عجب نہیں کہ ستارہ کوئی گزرتا ہوا
مدارِ گردشِ سیارگاں بدل جائے

(دیریاب)

خورشید رضوی موجودہ دور میں درآنے والی مباحثِ فکری وعملی کا عمیق نگاہی سے جائزہ لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک سماجی اقدار کا پاس اہم ہے۔ البتہ ایسی تبدیلی جو معاشرتی اقدار کا پاس رکھتے ہوئے منظر نامے پر نمودار ہو اور اس کو اپنایا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن اگر ہم زہریلی 'ہوا' میں سانس لینے کو ترجیح دیں جب کہ ہمیں پُر فضا مقام میسر ہو تو یہ خودکُشی کے سوا کچھ نہیں۔ اس حوالے سے وہ کہتے ہیں:

وہی موسم ہے ، وہی گل ، وہی خونریز ہَوا
مار ہی ڈالے نہ ہم کو یہ جنوں خیز ہَوا

دل پہ اب شہرِ خموشاں کی خموشی ہے محیط
کچھ بھی حاصل نہیں اے ولولہ انگیز ہَوا

(امکان)

یہ بات تو طے ہے کہ فقط قتل و غارت گری کی وارداتوں کو قلمبند کرنے ، ہر لمحہ سیاسی مسائل پر شعر کہنے ، معاشرے کے تلخ حقائق کو ہو بہو بیان کرنے سے بڑا ادب تخلیق نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کو فروغ ملتا ہے۔ خورشید اس بات سے واقف ہیں کہ دراصل احساسات و جذبات میں پیوست تخیل کا بیان ہی داخلی کیفیات کا آئینہ بن سکتا ہے نہ کہ لفظی بازی گری سے ہوتا ہے۔ خورشید رضوی کی غزل میں چھوڑ کر جانے والے کا دُکھ ، اُجڑے شہروں کی کہانی ، ریاستی بے ضابطگیوں کی بازگشت کے ساتھ اچھے اور بہتر زمانے ، نظام کی خواہش بھی موجود ہے۔ لیکن ان تمام موضوعات کو بیان کرتے ہوئے خورشید ادبی اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے بلکہ محاسنِ شعری کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنا مافی الضمیر لطیف پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔

بنا رہے کوئی دم نقشِ پا سے کون کہے
ابھی نہ خاک اڑائے ہوا سے کون کہے

(امکان)

بساطِ وقت پہ صدیوں کے فاصلے ہم لوگ
کنارِ شام و سحر میں کہاں ڈھلے ہم لوگ

نہ کارواں نہ مسافر مگر جرس نہ تھمی
نہ روشنی نہ حرارت مگر جلے ہم لوگ

(امکان)

قیامِ پاکستان اور قائداعظم کی وفات کے بعد سے لے کر اب تک ہمارے معاشرے کا بنیادی مسئلہ قیادت کا رہا ہے اب قحط الرجال کے دور میں دردِ دل رکھنے والا ہر انسان ایک عظیم انسان کی تلاش میں سرگرداں نظر آتا ہے اور قیامِ پاکستان کا بنیادی مقصد ہی یہ تھا کہ ایک ایسی پُر امن، منظّم ریاست کا قیام ہو جس کے افراد میں بھائی چارے، رواداری، بُردباری کا جذبہ موجود ہو مگر افسوس اس خواب کی تعبیر کے انتظار میں سات دہائیاں بیت چکی ہیں۔ قحط الرجال سے حوالے سے خورشید رضوی کے اشعار دیکھیں۔ خورشید رضوی کی شعری کائنات میں شاندار استعاراتی نظام ہے۔ وہ معاشرے میں موجود رجحانات، انسانی رویوں کی پستی، معاشرتی بدحالیوں کو بیان کرتے ہیں اور ماضی کی رفتہ کو یاد دلا کے موجود مسائل کا حل تلاش کرنے کی دعوت دیتے ہیں اور یہ سب ادبی پیرائے میں زیبِ قرطاس کرتے ہیں۔

کھو گئی دُور کہیں بانگِ درا، ڈھونڈ کے لائیں
دشتِ ماضی میں چلیں، اپنا پتا ڈھونڈ کے لائیں

(سرابوں کے صدف)

کچھ بے دلی بھی چاہیے بہرِ سکونِ دل
ہر لرزشِ صبا کے کہے پر نہ جایئے

(ایضاً)

خورشید کے نزدیک موجودہ زمانہ ذات کی گمشدگی کا زمانہ ہے۔ جہاں انسان بالخصوص مسلمانانِ عالم اپنی عزت و وقار کھو چکے ہیں۔ خورشید ایک مصلح کی مانند اس مسئلے کا حل بتاتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہمیں ماضی سے سبق سیکھنے کی ضرورت ہے جس کی بنیاد پر ہی مقام حاصل کیا جا سکے گا۔ خورشید رضوی ہاں میں ہاں ملانے کے قائل نہیں ہیں۔ وہ انکار و اقرار برموقع ضرورت و اہمیت سے بخوبی واقف ہیں۔ سیاسی نقطہ نظر سے خورشید کے ہاں قومی مفاد کے حق میں فیصلے کو اولین ترجیح حاصل ہے۔

زباں سے میں بھی لگایا کیا بہت پیوند
کسی طرح مرے دل کی شکستگی نہ گئی

(سرابوں کے صدف)

ایک آہٹ کو ترستے رہے زینے دل کے
اور اس کے بیچوں بیچ ڈولتا مکاں دل کا

(ایضاً)

دل وہ پاگل ہے کہ ہو جائے گا غرقاب وہیں
جھیل کی تہہ میں اگر عکسِ قمر پیدا ہوا

(امکان)

سیاسی شعور معاشرے میں صبر و استقامت کا باعث بنتا ہے۔ خورشید اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں ۔لہذا وہ ہر عکس و سراب کی پیروی سے گریز کا درس دیتے ہیں۔ بلکہ رہنما کے لیے صحیح جانچ پڑتال کے قائل ہیں ۔خورشید معاشرے کے حقائق سے بخوبی آگاہ ہیں ۔ ان کے ہاں متوازن خیالات کا رجحان زیادہ ہے ۔ وہ پہلی ملاقات میں حالِ دل کہنے کے (چاہے یہ صورتحال انفرادی ہو یا اجتماعی) حامی نہیں ہیں۔

دو حرف تسلی کے جس نے بھی کہے، اُس کو
افسانہ سُنا ڈالا ، تصویر دکھا ڈالی

(شاخِ تنہا)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو خورشید رضوی کی غزل ہر سطح پر تمام صورتحال کا احاطہ کرتی ہے ۔ خورشید رضوی نے اپنی غزل میں سیاسی و سماجی بصیرت کو اختیار کیا ہے اور اپنے فکر و فن کے ذریعے نہ صرف سماجی و سیاسی مسائل کا ادراک حاصل کیا ہے ۔ بلکہ ان مسائل تک رسائی حاصل کر کے حل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے ۔

نئے علوم خلاؤں میں راج کر لیں گے
مگر یہ دل کے سمندر نہیں بلونے کے

(سرابوں کے صدف)

ہیں خیل و خواب و خوں سب طوف میں اس کے
مثلِ سنگِ کعبہ ہے ، سنگِ آستاں دل کا

(سرابوں کے صدف)

خورشید رضوی کی شاعری کی عمارت بنے بنائے خطوط پر استوار نہیں ہے بلکہ وہ اپنی طبع سے نئے راستے بناتے ہیں۔ خورشید رضوی کی غزل میں معاشرے کو تبدیل کرنے کی خواہش موجود ہے ۔ لیکن ہمارے موجودہ نظام کے تحت اور حالات حاضرہ کے پسِ منظر میں وہ مایوسی کا اظہار کرتے ہیں ۔

اس جہاں کے تو ہے شایاں صرف مرنے کی امنگ
لغو ہے کتنی یہاں کچھ کر گزرنے کی امنگ

(شاخِ تنہا)

خورشید کی غزلیات میں انسان اور مسائلِ معاشرہ پر بہت واضح انداز میں بات کی گئی ہے۔ وہ ایک دردمند انسان ہیں جس کی وجہ سے انہیں تمام معاشرے کا دکھ اپنا دکھ معلوم ہوتا ہے۔ اس بات کو پروفیسر حسن عسکری کاظمی ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> ''خورشید رضوی دانش جو، فلسفی، مفکر اور سخن ور ہونے کے ساتھ ساتھ، دردمند انسان ہیں۔ ہمارے گردوپیش میں تذلیلِ انسانیت کے مظاہر خون رونے اور شہرآشوب ہماری خواہش پیہم کے لیے ہیں۔۔۔خورشید رضوی کی زندہ اکائی اورغم نوائی کا وسعت پذیر حرف رسا ہے، جو حصارِ ذات سے باہر آکر ہماری نوحہ خوانی کرتا ہے''۔ [۶]

زندگی کٹتی چلی جاتی ہے اس کا نہیں رنج
رنج یہ ہے کہ کبھی ڈھنگ سے زندہ نہ رہے

جس پھول کو دیکھوں یہی لگتا ہے کہ اس میں
اک رنج بھی رہتا ہے مسرت کے علاوہ

ہر جبر سے خاموش گزر آئے کہ افسوس
سر بھی ہمیں درکار تھا عزت کے علاوہ

(امکان)

ظلم کے خلاف خاموشی کو ظلم کی حمایت گردانا جاتا ہے۔ خورشید بھی اسی جانب طنزیہ انداز میں اشارہ کرتے ہیں۔ کیوں کہ جان کی امان اُسی صورت ممکن ہوگی جب یا تو مظلوم سے بیزاری اختیار کی جائے یا خاموشی اختیار کی جائے یا ظالم کی علی الاعلان حمایت کی جائے۔ خورشید رضوی کی شاعری میں سیاسی صورتحال کے نتیجے میں ادیبوں پر لگائی جانے والی پابندیاں، ان پر کیے جانے والے مظالم کا واضح اظہار ملتا ہے۔ لیکن اس مزاحمتی انداز میں بھی مصلحانہ رنگ نمایاں ہے۔

انگشت اگر قلم نہ ہو گی
خونابی دل رقم نہ ہو گی

رونا ہے تو آج کھل کے رو لو
کل تک یہ فضائے غم نہ ہو گی

(دیریاب)

خورشید کی شاعری احساس و جذبات سے منسلک ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ انسان کے احساس و جذبات سے نمو پاتی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔خورشید اپنا مشاہدہ تجزیاتی انداز میں بیان کرتے ہیں۔

دل میں وہ جا بسا رگِ جاں کاٹتا ہوا
لو آج ہم نے آنکھ سے دیکھا سُنا کیا

(شاخِ تنہا)

خورشید رضوی کی شعریات کا خاکہ بھی معاشرے سے وجود میں آتا ہے۔ان کے ہاں معاشرتی مسائل کا بیان موجود ہے لیکن وہ اس کو جُز وقتی مسئلہ نہیں سمجھتے وہ کُل وقتی مسائل کے بیان کے ساتھ ان کے حل کی جانب قدم بڑھانے کو انتہائی ضروری سمجھتے ہیں۔نوید صادق کہتے ہیں:''ڈاکٹر صاحب کے ہاں عصری شعور کی جھلکیاں نمایاں ہیں لیکن ان کے اشعار کسی وقتی تحریک یا ہیجان کا نتیجہ معلوم نہیں ہوتے بلکہ وہ انتہائی منجھے ہوئے انداز میں اپنا مدعا بیان کرتے ہیں''۔ے زندگی کا جداگانہ تصور بڑے شعراء کے ہاں موجود ہے۔خورشید بھی ان میں سے ایک ہیں ان کے لیے زندگی گزارنا 'روٹین لائف' نہیں ہے بل کہ ہر وقت نئے انداز سے مختلف زاویوں سے زندگی کے متعلق سوچنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔سب سے بڑی خوبی جو ان کے ہاں موجود ہے وہ یہ کہ وہ صرف اظہار تک بات نہیں چھوڑتے بلکہ مکمل ادراک کے ساتھ اس کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں منیر نیازی کہتے ہیں :''کاروبارِ حیات ان کے لیے فقط کاروبار نہیں وہ اس سے ایک نئی حقیقت ایک طرزِ نو کے بارے میں سوچتے اور اس کا اظہار کرتے ہیں۔ایسے شاعر دورِ جدید میں نہ ہونے کے برابر ہیں''۔۸

وُہی ہے آنکھ ،وہی شب ہے ،خواب بدلا ہے
مٹا کہاں ہے ابھی اضطراب بدلا ہے

بدل گیا ہے زمانہ بہت ، پہ کیا بدلا
یہی کہ حدِ نظر پر سراب بدلا ہے

خورشید رضوی کی شاعری میں ہمارے اس سیاسی سسٹم پر کڑی تنقید موجود ہے۔ان کے نزدیک سیاسی نظام میں ابھی بہت بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت ہے جس کے نتیجے میں اضطراب میں کمی واقع ہو نہ کہ تبدیلی

۔خورشید رضوی اسے سراب کی مانند کہتے ہیں۔

اسے کبھی ،کسی کروٹ ،نہ مل سکا آرام
سدا عذاب سے دل نے عذاب بدلا ہے

(سرابوں کے صدف)

خورشید رضوی کی شاعری کی نمود کسی ماورائی سوچ کا نتیجہ نہیں بلکہ ان کے ہاں تجربہ، مشاہدہ اور نتیجہ اپنے پورے کمال کے ساتھ موجود ہیں۔خورشید رضوی سیاسی وسماجی صورتحال سے مکمل آگاہی رکھتے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی رقمطراز ہیں:

''بنیادی طور پر خورشید رضوی جذبے کی گہرائیوں اور لطافتوں کا شاعر ہے اور جذبے کی انتہائی باریک پرتوں کو وہ جس بے ساختگی اور سادگی سے اپنی غزل میں چھوتا ہے وہ آج کے دور میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔آج کل تو جذبے کا قتل ہی نام نہاد جدت کی پہچان ہے۔مگر جب جذبہ قتل ہوتا ہے تو شاعری بھی دم توڑ دیتی ہے۔خورشید رضوی کا جذبہ بھی زندہ ہے اس لیے اس کی غزل بھی توانا ہے''۔ ۹

گویا خورشید کے ہاں جذبہ ایک توانا پیغام کی شکل اختیار کرتا ہے۔جو ہر پڑھنے والے کو متاثر کرتا ہے۔ان کی شاعری میں اجتماعی پہلو نمایاں انداز میں موجود ہیں۔انہی خصائص کی بنیاد پر ان کی شاعری ان کے ہم عصر شعراء میں نمایاں مقام کی حامل ہے۔خورشید رضوی ادبی طور پر 'حلقہ اربابِ ذوق' سے وابستہ رہے اور حلقے کے جنرل سیکریٹری بھی رہے۔خورشید رضوی کی غزلوں کے سماجی مطالعے اور ان کے سماجی شعور کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی غزلوں پر حلقے سے وابستگی کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔خواہش اور جدوجہد میں بہت فرق ہے۔خورشید رضوی خواہش کے مفہوم کے لیے آرزو، تمنا، رغبت، شوق جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں ،جب کہ جدوجہد کی تشریح میں وہ دوڑ، دھوپ اور جانفشانی کو بنیاد بناتے ہیں۔خورشید رضوی کی تخلیقی زندگی کا تعلق روایتی تعیش پسندی سے نہیں ہے۔آپ کی غزلیات، زندگی اور سماج کے باہمی رشتوں سے ہم کنار نظر آتی ہیں۔آپ اپنے دور کی بدلتی ہوئی فکری اور ذہنی روش سے متاثر دکھائی دیتے ہیں۔جن کا اثر آپ کی تخلیقات پر بھی نمایاں نظر آتا ہے۔آپ نے غزل کو جو کہ ایک روایتی صنفِ سخن کو اپنے سماج کا آئینہ دار بنا دیا۔

ماضی کو بھی دیکھیں گے اب اپنی ہی نظر سے
اس کی بھی خبر کچھ نہ ملی ، اہل خبر سے

کچھ گُم ہوئے اوراق روایت میں نہ آ کر
کچھ مسخ ہوئے حُسنِ روایت کے اثر سے

مٹی میں تو رنگوں کے خزانے نہیں ہوتے
کیوں ، اے گُلِ نو رستہ ، تو آیا ہے کدھر سے

(امکان)

خورشید رضوی کے ہاں زوال پذیر اقدار کا دکھ موجود ہے ان کے نزدیک ہمیں اُن چیزوں کو ترک نہیں کرنا چاہیے جن کی بنیاد ہمارے روح سے مشتق ہے۔

ہر اک نیند میں ڈوبے ہوئے شبستاں تک
بلا سے کوئی نہ جاگے ، مگر اذاں گئی ہے

(امکان)

خورشید کہتے ہیں کہ زمانہ اس تیزی سے کروٹیں لے رہا ہے کہ شاید اس کا اندازہ کچھ عرصہ پہلے نہیں کیا جا سکتا۔ سیاسی و سماجی سطح پر بین الاقوامی سطح پر انقلابی صورتحال نمایاں ہے۔ اس دوڑ میں شامل ہونا جہاں ہر کسی کے لیے ضروری ہے وہیں مجبوری بھی ہے۔ لہذا ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کو سمجھیں اور اس سے مستفید ہوں۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے آذان کی آواز تو ہر ایک کے لیے ہے لیکن اس پر عمل کرنے والے افراد محدود ہوتے ہیں۔

زنگ آلود سلاسل کہ جو بج بھی نہ سکیں
پاؤں میں کہنہ زمیں پہ یہ فرسودہ فلک

(امکان)

خورشید رضوی فرسودگی کے قائل نہیں ہیں۔ وہ ہر سطح پر تبدیلی کے خواہاں ہیں۔ کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ جب تک عصری ہم آہنگی نہیں ہوگی ترقی کی جانب قدم نہیں بڑھایا جا سکتا۔

جب انجمن میں تھا تو میں تنہا تھا اور اب
تنہا ہوں اور انجمن آرائیوں میں ہوں

(سرابوں کے صدف)

خورشید کی شاعری میں انسان اور اس کے متعلقات کا ذکر قطعی بوجھ محسوس نہیں ہوتا بلکہ اس سے خیال کی

نُدرت کا احساس جنم لیتا ہے۔

ممکن ہے کہ صحرا کو گلستاں میں بدل دیں
کچھ اس سے مگر وحشتِ آہو نہیں جاتی

تصویرِ لبِ یار سے ، سوکھے ہوئے گُل سے
سُرخی بھی چلی جائے تو خوشبو نہیں جاتی

(دیریاب)

سرِ بُریدہ کی صورت ، ہوا سے گر ہی نہ جائے
گلاب شاخ پہ پھوٹا نہیں رکھا ہوا ہے

(دیریاب)

خورشید رضوی کی غزلوں کا شمار ایسی شاعری میں ہوتا ہے جو روایت سے تنگیِ دامن کا داغ مٹانے میں اہم کردار ادا کرتے ہوئے اپنی کوششوں کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔خورشید کی شاعری میں متنوع موضوعات کا استعمال ان کے ساتھ اُردو غزل کو بھی جدیدیت سے ہم آہنگ کرتا ہے۔فاروق مونس اپنے الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں :

''خورشید رضوی اُردو ادب کے ان معدودے شعراء میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے نہ صرف اُردو غزل کے کلاسیکل مزاج کو اپنایا بلکہ جدیدیت کو اس سے مس کر کے اس میں حیرت انگیز بوقلمونی پیدا کی۔عام قاری کے لیے شاید اس میں دلچسپی کا سامان نہ ہو مگر ادب کا سنجیدہ قاری اس امر سے بخوبی واقف ہے کہ یہ انتہائی دشوار گزار عمل ہے۔جہاں شاعر کو دیارِ غزل میں پہلے ہی فنی لحاظ سے اور محدودیت کی بناء پر سنبھل سنبھل کر چلنا ہوتا ہے ۔وہاں اس دوہرے عمل یعنی کلاسیکیت اور جدیدیت کو بھی برقرار رکھنا پڑتا ہے۔یہ کام قادر الکلام شعراء سرانجام دے سکتے ہیں ۔جو وسعتِ مطالعہ، گہرے مشاہدے اور زبان وعروض کے علاوہ شاعری کے بارے میں واضح نقطہ نظر رکھتے ہوں''۔[۱۰]

خورشید رضوی کی غزل میں جہاں معاشرے کے تمام پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے وہیں انہوں نے اس بات کا

اہتمام بھی بخوبی کیا ہے کہ معاشرے کے ایسے حالات کے بیان میں غزل کے آہنگ کو تبدیل نہ کیا جائے۔یہی ایک بڑے شاعر کی خوبی ہے کہ فن کی روح کو سلامت رکھتے ہوئے اپنی بات الفاظ کے پیرائے میں بیان کی جائے۔

ترے ہجر ، تیرے وصال ، اپنے خیال میں
کسی آئینے میں ، میں سب کا سب نہیں آ سکا

(امکان)

نکل گیا تھا سرِ شام کارواں تیرا
تمام شب ترے نقشِ قدم سے بات رہی

خورشید رضوی وقت کی اہمیت سے بخوبی واقف ہیں۔ان کے نزدیک معاملات زندگی چاہے وہ سیاسی حوالے سے ہوں یا سماجی حوالے سے بر وقت سرانجام دینا چاہیے۔کیوں کہ وقت گزرنے کے بعد انسان کے ہاتھ نشانات کے علاوہ کُچھ نہیں آتا۔

زمین سخت ہے اور رہبری ہے میرے سپرد
لہو میں پاؤں ڈبو لوں تو نقشِ پا اُبھرے

بغیر از راہنما قوم ترقی نہیں کر سکتی۔اس لیے کسی ایسے شخص کا انتخاب کرنا از حد ضروری ہے جو اپنی فکر کیے بغیر کارواں کو لے کر آگے چلے۔خورشید بھی اسی بات کی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ راہنماؤں کے لیے ماحول کی سازگاری یا نا سازگاری بے معنی ہونی چاہیئے ،ان کے لیے ملک وقوم کی سلامتی سب سے اولین ترجیح ہونی چاہیے۔

زمانے بھر سے الگ ہو کے میں ادھر کو چلا
جدھر جدھر سے مرے دل کی رہگذر گزری

(سرابوں کے صدف)

ہر قوم کی ایک اجتماعی سوچ اور مزاج ہوتا ہے۔خورشید اس اجتماعی سوچ اور مزاج کو بخوبی سمجھتے ہیں۔اسی لیے ان کی غزل میں معاشرے کے تمام رنگ ملتے ہیں۔خورشید نے جو ادب تخلیق کیا ہے اس کا تعلق جتنا ان کی ذات سے ہے اتنا ہی ان کے گردو پیش سے بھی ہے۔اس بات میں کوئی شک نہیں کہ خورشید رضوی کی غزل اپنے ماحول کی مکمل عکاسی ہے۔جس میں پاکستان کی روایت،حالات،تہذیب وثقافت ،پس منظر سے مطابقت موجود ہے۔

خورشید کی غزل کا معنوی دائرہ دراصل ان کے سماج سے تخلیق ہوتا ہے۔ان کے ہاں مشاہدہ کی قوت جب احساس وجذبات سے ملتی ہے تو ایک توانا تخیل سامنے آتا ہے۔جس کے ذریعے خورشید اپنا مافی الضمیر بیان کرتے ہیں۔

۲۔ خورشید رضوی کی غزل میں سماجی شعور:

انسانی سماج انسانوں کے باہم تعلقات اور ان کے باہمی ربط و ضبط سے قائم ہوتا ہے۔ یہ لاکھوں سالوں کی مدت میں ارتقائی مراحل سے گزر کر تکمیل کے مراحل تک پہنچتا ہے۔ ارتقا کبھی رُکتا نہیں کے ہر لمحہ جاری رہتا ہے۔ انسان سماج میں روح کی مانند ہے۔ انسان ہی اس سماج کو اپنی روز مرہ کی کارگزاریوں کی بنیاد پر بلندی و پستی کی جانب دھکیلتا ہے۔ انسان کی ایجادی و تخلیقی کوششیں سماج کے خدوخال مرتب کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ سماج میں زندگی کا ارتقاء انسانی ذہن کی نشو ونما کے بغیر ممکن نہیں، اسی لیے کسی بھی ادیب یا شاعر کی ادبی خدمات کا جائزہ لینے سے قبل اس کے سماجی ماحول سے آشنائی اشد ضروری ہے۔

اس زاویے سے سوچنا چاہیے کہ کیا ادیب اپنے معاشرے سے الگ ہوتا ہے؟ اگر وہ اپنے سماج سے الگ نہیں رہے تو پھر سوال پیدا ہوتا کیا وہ اپنے معاشرے کا فرد ہونے کا حق ادا کر رہا ہے یا نہیں؟ جب ہم اسے معاشرے کا اہم فرد تسلیم کریں گے تو یہ بھی حقیقت ہے کہ حقیقی تخلیق کار اپنے اردگرد کے ماحول سے آنکھیں نہیں چرا سکتا۔

ادب اور سماج کے درمیان تعلق کے مباحث کا آغاز دراصل سرسید احمد خان اور مولانا الطاف حسین حالؔی کے زمانے سے ہوا۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے تو بجا ہوگا کہ ان افراد کی تحریروں نے ہی ادب اور سماج کے مباحث کو جنم دیا۔ سرسید کے رسالے 'تہذیب الاخلاق' اور الطاف حسین حالی کی تنقیدی کتاب 'مقدمہ شعر و شاعری' سے اس کی ابتدا ہوئی۔ حالؔی سرسید کے افکار کے زیر اثر اس نظریے کو لے کر آگے بڑھے کہ شاعری سماج سے متاثر ہوتی ہے۔ سماج کو متاثر بھی کرتی ہے اور قوموں کی تعمیر میں ایک وسیلے کی حیثیت رکھتی ہے۔

سرسید تحریک سے ترقی پسند تحریک تک ہماری ادبی زندگی نے جو منازل طے کی ہیں ان سب میں سے اہم پہلو زندگی اور سماج سے ادب کے تعلق کا شعور عام ذہنوں میں بھی راسخ ہو گیا تھا۔

سرسید احمد خان اور حالؔی کے زمانے سے ادب اور سماج کو سمجھنے کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ بیسویں صدی میں نمایاں ہوا۔ اور بیسویں صدی کی ابتداء کوئی خوش کن انداز میں نہیں ہوئی بلکہ پوری دنیا عجیب طرح کی سراسیمگی کے عالم میں تھی اور برصغیر میں تو ویسے بھی حالات ابتر تھے۔ بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں جنگ عظیم نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا جس کے اثرات بالواسطہ یا بلا واسطہ کسی نہ کسی انداز سے متحدہ ہندوستان پر بھی دکھائی دیے اس کے بعد انقلابِ روس نے بھی ہر حوالے سے معیارِ زندگی کو متاثر کیا۔ اس عرصے میں ادب کے میلانات و رجحانات نے بھی کروٹ تبدیل کی بالخصوص اس دور کی غزل میں ہمیں روایت

سے علامت کی جانب کے سفر کا آغاز ملتا ہے تو دوسری جانب اصغر، فانی وغیرہ کی جانب سے ہمیں قنوطیت کے سائے بھی ادب کی سرزمین پر منڈلاتے نظر آتے ہیں۔ اس زمانے میں اقبال ایسے شاعر کے طور پر منظر عام پر آئے جن کی غزل بیک وقت داخل بعد خارج کی طرف سفر کرتی نظر آتی ہے۔

ایسے معاشرے میں جہاں گوناگوں صورتحال ہمہ وقت موجود رہے وہاں مایوسی و نا امیدی کا دور دورہ ہوتا ہے۔ جس کا اثر تخلیق کار پر پڑتا ہے جس کے نتیجے میں فن کار ماضی سے اپنا رشتہ مضبوط کرتا ہے اور روایت کی طرف سفر کو جاری رکھتا ہے۔ خورشید رضوی کا شمار بھی ایسے شعرا میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں گو کہ نا امیدی کی فضا کو نہیں اُبھارا لیکن روایت سے انسلاک ہمیں واضح انداز میں ان کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ خورشید رضوی کا سماجی شعور سماج میں موجود روایتی اقدار، رویوں، رجحانات کی شکست و ریخت سے وجود میں آتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

> ''روایت سے منسلک شاعر کے ہاں معاشرے سے تعلق خاطر قوی اور قواعد وضوابط کا احترام ایک مسلک کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اپنے زمانے کے اخلاقی، جمالیاتی اور سیاسی عقائد کو تسلیم کرتا ہے اور شعری محاورے، تلمیح اور زبان کے رائج اور نا قابل فہم استعمال پر اپنی جان نچھاور کرتا ہے''۔[۱۱]

گویا روایت سے منسلک فرد سماجی اقدار کی بجا آوری میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتا۔ اس کے نزدیک یہ ایمان کا حصہ بن جاتا ہے کہ وہ اپنے سماج کی بہتری کے لیے ان قواعد کا احترام کرے جن کی وجہ سے معاشرہ امن کی راہ پر گامزن ہو سکے۔ خورشید رضوی بھی اسی انداز سے اپنے فن کا بیان کرتے ہیں۔

فن ہے وہ آہوئے وحشی کے لیے پھرتا ہے
سرِ صحرائے فنا، خلد کے باغوں کی مہک

(امکان)

انسانی ذہن جو بھی کہتا ہے بلکہ یوں کہیں کہ اس کی جتنی بھی تخلیقی کاوشیں ہوتی ہیں وہ مقصدیت ہی کی پیداوار ہوتی ہیں وہ شاعری ہو، مجسمہ سازی ہو یا رقص و موسیقی۔

روایت سے منسلک ہو کر ہی انسان صحیح طور پر ماضی سے سبق سیکھ سکتا ہے، خامیوں کو دور کر سکتا ہے اور خوبیوں کا اعادہ کر سکتا ہے۔ اس لیے خورشید رضوی کہتے ہیں:

ذرا میں زخم لگائے ذرا میں دے مرہم
بڑے عجیب روابط مرے صبا سے ہیں

(شاخِ تنہا)

خورشید رضوی اُردو غزل کی روایت سے جُڑے ہوئے ایسے منفرد شاعر ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو روایتی انداز میں نہیں رنگا بلکہ روایت کے قافلے کی راہنمائی کرتے ہوئے اسے جدیدیت کی منزل تک لے آئے ۔ان کے ہاں ہمیں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جن میں روایت سے استفادہ بھی موجود ہے اور جدید فکر بھی ۔خورشید رضوی کی شاعری میں روایتی الفاظ معنی کے جدید لبادوں میں لپٹے ہوئے ہیں:

آنکھ میچو گے تو کانوں سے گزر آئے گا حُسن
سیل کو دیوار و در سے واسطہ کوئی نہیں

(شاخِ تنہا)

خورشید رضوی کا مشاہدہ جب الفاظ کی شکل میں قاری کے سامنے آتا ہے تو مجسم شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ان کے ہاں تخیل کی تبدیلی اصل تبدیلی نہیں ہے بلکہ سماج کے لیے عملی تبدیلی کو ضروری سمجھتے ہوئے کہتے ہیں۔

ممکن ہے کہ صحرا کو گلستاں میں بدل دیں
کچھ اس سے مگر وحشتِ آہو نہیں جاتی

(ایضاً)

خورشید کے نزدیک انسان کسی طور بھی اطمینان کی منزل پر نہیں پہنچتا۔شاید اس کی وجہ سماجی دشواریاں ہوں یا وہ خواہشات جو کبھی تکمیل تک نہیں پہنچتی ہیں۔

دم بدم دستِ قضا میں سوچتا ہے اب حباب
جانے سر میں کیوں سمائی تھی اُبھرنے کی امنگ

(شاخِ تنہا)

انسان سماج میں رہ کر اس کی حقیقتوں، لوگوں کے رویوں، رجحانوں، عادات واطوار کا جائزہ لیتا ہے اور شاعر کے لیے ان کا اظہار جہاں اس کے مشاہدے کا پتہ دیتا ہے وہیں نام اس کا اظہار کرنے سے کتراتے نہیں کیوں کہ درحقیقت وہ اظہار ہی کیتھارسس کا عمل ہے، جو اسے داخلی طور پر اطمینان بخشتا ہے۔خورشید رضوی کی شاعری میں سماج میں اخلاقی اقدار و روایات کی پاسداری بہت اہمیت رکھتی ہے۔ان کے ہاں انسانوں کا مل جُل

کر رہنا، ایک دوسرے کے دُکھ درد میں شریک ہونا سماج کے لیے نہایت ضروری ہے۔ لیکن جدید معاشروں میں اس کا فقدان نظر آتا ہے۔ ہر انسان کی مصروفیات اتنی بڑھ چکی ہیں کہ دوسروں کا خیال اس کی زندگی کا جزو نہیں رہا۔ اس حالت سے ہر وہ شخص پریشانی میں مبتلا ہے جس نے معاشرے میں افراد کو اخلاقیات پر عمل کرتے دیکھا ہے۔ خورشید اسی صورتحال کو خوبصورت انداز میں بیان کرتے ہیں۔

سب کے سب اپنے گریبانوں میں ہیں ڈوبے ہوئے
گل سے گل تک رشتہ موج صبا کچھ نہیں

(شاخِ تنہا)

انسان کی زندگی خواب اور تعبیر کے درمیانی عرصے کا نام ہے۔ اس معاشرے میں بھی ہر شخص خواب کی تکمیل میں اپنی زندگی کو گزار کر موت کو گلے لگا لیتا ہے۔ معاش انسان کا بنیادی مسئلہ ہے۔ معاشی طور پر مستحکم معاشرے میں انتشار کی کیفیت نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ خورشید اپنے سامنے موجود سماج میں زندگی گزارنے والے شخص کی زندگی کا خاکہ مندرجہ ذیل شعر میں بناتے ہیں۔

دل میں اک خوابِ حسیں ، ذہن میں اندوہِ معاش
اور دروازے پہ ایام کی پیہم دستک

(امکان)

آزادی کے بعد کی اُردو شاعری نے موضوعاتی انداز سے جو کروٹ لی وہ سب اس وقت کے حالات و واقعات کا سبب تھا۔ دوسری جانب ترقی پسند تحریک کے اثرات بہت سُرعت سے اثر انداز ہو رہے تھے جس کی وجہ سے ادبی برادری نا چاہتے ہوئے بھی دو گروہوں میں منقسم نظر آنے لگی۔ جس کا اظہار ان کی تخلیقات سے ظاہر ہوتا ہے منیر نیازی اس حوالے سے کہتے ہیں:

''پاکستان میں دو طرح کے شاعر ہیں۔ ان کی ایک قسم ہر وقت اور ہر دم صفحہ ظہور پر رہتی ہے۔ ان کی ہستی اسی سبب سے اور وہ اس سے یکسر غافل نہیں رہتے۔ دوسری طرح کے شاعر نمائش شعر سے زیادہ تخلیق شعر میں مبتلا رہتے ہیں اور خورشید رضوی اسی دوسرے قبیل سے شعرا میں سے ہیں''۔ ۱۲

خورشید رضوی کی تخلیق عامیانہ پن سے بہت دور ہے۔ جس کی وجہ خیال کو تخلیقی عمل کی آنچ سے اُس وقت تک حدت فراہم کرنا ہے جب تک پختگی کی ضمانت اپنے اندر سے مستخرج نہ ہو۔ کیوں کہ تخلیق کار خود ہی اپنا پہلا نقاد ہوتا ہے اور خیال کی اولین کسوٹی وہ جذبہ ہے جو اسے بہتر سے بہترین کی جانب گامزن رکھتا ہے۔ لفظ

بھی اس ہیرے کی مانند ہے جس کی تراش خراش سے پیدا ہونے والی چمک ہی اسے دوسرے جواہرات میں ممتاز بناتی ہے:

ابھی لبوں پہ نہیں ہے جو روشنی دل میں
ترش رہی ہے ابھی لفظ کی کنی دل میں

(سرابوں کے صدف)

خورشید رضوی کی غزل میں سماج اور انسان کا رشتہ واضح انداز میں موجود ہے۔ خورشید کے ہاں تمام تر سماجی مشکلات کے باوجود ایسے جذبے کی نمود ہے جس میں مثبت پہلو نمایاں ہیں۔ خورشید کی غزل میں بقا کا احساس غالب ہے جس کے لیے وہ مضامین کہنہ کو نئے معنی دیتے ہیں جو کہ ان کے تخیل کی جدت کی وجہ سے ہے۔

حباب ہوں مرا مسکن ہی سطحِ آب پہ ہے
مجھے تو سات سمندر نہیں ڈبونے کے

(سرابوں کے صدف)

آج کل سماجی ارتقا اتنی تیز رفتاری سے وقع پذیر ہو رہا ہے کہ افراد کا اُس کے ساتھ سفر کرنا بہت مشکل ہو رہا ہے۔ ایسے میں معاشرے میں افراد کی نفسیات میں تفاوت دیکھنے میں آیا ہے۔ بعض افراد اپنی اقدار کو چھوڑ کر مکمل طور پر مغرب زدہ زندگی گزار رہے ہیں۔ لیکن اسے افراد بھی موجود ہیں جو تبدیلی کو بھی قبول کرتے ہیں لیکن اپنی اقدار و روایات کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ خورشید رضوی کی غزل میں موخر الذکر فرد کا احساس شدت سے موجود ہے۔ ان کی غزل میں ایسا فرد موجود ہے جو جذبات کے جزیرے میں لطف اندوز ہونا چاہتا ہے اس سے نکلنا نہیں چاہتا۔ وہ اقدار کی پابندی کو نصب العین مانتا ہے۔ وہ معاشرے کے رائج اصولوں کی پاسداری کر کے جذب و احساس کی فصل کو پروان چڑھانے کا قائل ہے بقول خواجہ زکریا:

> ''ایک ایسا شریف انسان جو جذبات تو دوسروں سے مختلف نہیں رکھتا، مگر اپنے جذبات کو بہ ہر قیمت آسودہ کرنے سے نفرت کرتا ہے جسے شدید احساس ہے کہ وہ ایک معاشرے کا فرد ہے اور معاشرے نے انسانوں پر کچھ پابندیاں عائد کر رکھی ہیں''۔ ۱۳

خرد سے دور غمِ تند خو میں اچھے تھے
اسی جنوں میں ، اسی ہاو ہو میں اچھے تھے

(شاخِ تنہا)

خورشید کے غزل میں سماجی آگہی ایک کربِ مسلسل ہے جو انسان کو اندر سے ختم کر دیتا ہے اور وہی انسان کسی نہ کسی حد تک سکون میں ہے جو کیفیتِ جنوں میں ہے۔ جو اپنی ذات کے دائرے میں گردش کر رہا ہے ۔جس کے لیے دلفریبیِ غمِ جاناں سے غمِ روزگار میں تبدیل نہیں ہوتی ۔

دل میں اک خوابِ حسیں ، ذہن میں اندوہِ معاش
اور دروازے پہ ایام کی پیہم دستک

(امکان)

نکل کے آپ سے باہر خراب و خوار ہوئے
مدام غرق ہم اپنے لہو میں اچھے تھے

(شاخِ تنہا)

خورشید رضوی برصغیر کی تقسیم سے پانچ سال قبل پیدا ہوئے ،اور یہ دور آزادی کی تحریکوں کے عروج کا دور تھا۔ ہر طرف برصغیر کی تقسیم کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ خورشید رضوی ضلع مراد آباد کے ایک چھوٹے سے قصبے امروہہ میں پیدا ہوئے ۔امروہہ مسلم اکثریت کا علاقہ تھا۔ لہٰذا تقسیم کے فسادات و حادثات کا اثر براہ راست امروہہ پر نہ ہوا۔ مگر یہ ممکن نہیں کہ پورا باغ آگ کی لپیٹ میں ہو اور ایک پھول کو کچھ نہ ہو۔ امروہہ کا ماحول تقسیم سے قبل مکمل طور پر علمی و ادبی تھا۔ اگر اُچٹتی نظر ڈالی جائے تو امروہہ کی سرزمین نے اُردو ادب کو بہت سے اعلیٰ پائے کے ادیب دیئے ۔ جن میں علمی حوالے سے سب سے بڑا نام علامہ نسیم امروہوی ،مشہور مصور صادقین ،جدید اُردو غزل کے نامور شاعر جون ایلیا اور جدید کلاسیک ادب کا حسین امتزاج خورشید رضوی کا تعلق بھی امروہہ سے ہے۔ گو کہ خورشید رضوی نے امروہہ میں ایامِ طفولیت بھی سکون سے نہیں گزارے مگر امروہہ کا اثر خورشید رضوی پر موجود ہر حوالے سے موجود ہے۔

رو رہا ہوں ہر پُرانی چیز کو پہچان کر
جانے کس کی روح میرے روپ میں لائی گئی

(شاخِ تنہا)

امروہہ ہندوستان کا ایک دور افتادہ قصبہ ہے۔ جہاں ہمیں جاگیرداری نظام کے اثرات نظر آتے ہیں۔ یہاں کے افراد کی سماجی و اقتصادی سوچوں میں خود پسندی کا عنصر نمایاں ہے ۔ خورشید رضوی کی ابتدائی زندگی پر معاشرتی حالات بہت اثر انداز ہوئے۔ بچپن میں جب خوابوں کا زمانہ تھا تو ہجرت کے دُکھ نے آگھیرا

اور آپ امروہہ کی یادوں کا بوجھ اور آبائی وطن کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہنے کا دُکھ دل میں لیے پاکستان آئے۔ اس سیاسی افراتفری اور معاشرتی ہنگاموں کے اثرات خورشید رضوی کی غزلوں میں نمایاں نظر آتے ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

۱:انسانی رشتے،۲: زندگی کی منفی اور مثبت قدروں کا شعور،۳:تعلیم وتربیت، اخلاق، اقدارِ حیات،۴: زندگی اور معاشرتی ماحول کے ادب آداب، ۵: نصب العین، اہدافِ حیات، ۶: معاشرے میں مرد وعورت کے امتیازی

مقامات کا تعین، ۷: زبان، محاورے، روزمرہ، ۸: مذہبی تلمیحات، استعارات

مدت سے ہے اشکوں کا تلاطم پسِ مژگاں
رونے کے لیے کوئی بہانہ نہیں ملتا

(شاخِ تنہا)

حادثہ یہ ہے کہ سیلابِ زماں کے روبرو
لوحِ دل سے، رفتہ رفتہ، نقشِ خوں جاتا رہا

(شاخِ تنہا)

خورشید رضوی کا ادبی سفر بیسویں صدی کا ہے۔ یہ دور اُردو ادب کی ترویج کا اہم ترین دور رہا ہے، یا یہ کہا جائے کہ ادب اور سماج کی مباحث اس دور میں اپنے نقطہ عروج پر پہنچیں تو بے جا نہ ہوگا۔ خورشید رضوی کے سماجی شعور کو بہتر طور پر جاننے کے لیے جہاں ادب اور زندگی کے حوالے سے ہونے والی بحثیں ہماری مدد کرتی ہیں وہاں اس بات کو بھی جاننا اشد ضروری ہے کہ خورشید رضوی کے نزدیک نظریہ حیات کے اصل خدوخال کیا ہیں؟ خورشید رضوی ایسے معاشرے کے فرد ہیں جہاں معاشرتی ناہمواریاں، طبقاتی کشمکش ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہیں۔ خورشید تلاشِ ذات میں ہر دم مگن رہنے والے شاعر ہیں وہ بہت عمیق نگاہی سے زمانے کے اندر اپنے آپ کی تلاش کے عمل سے گزرتے ہیں۔

جن لوگوں میں رہتا ہوں، میں اُن میں سے نہیں ہوں
ہوں کون، مجھے اپنا زمانہ نہیں ملتا

(شاخِ تنہا)

جہاں صاحبِ اقتدار لوگوں کے لیے عام آدمی کا استحصال کرنا معمولی بات ہو۔ جہاں عام آدمی روزانہ

کی بنیادوں پر طلوعِ آفتاب سے پہلے اپنے لیے رزق کی تلاش کی خواہش لیے بازاروں اور چوکوں پر قنوطیت کی مجسم تصویر بنے کھڑا ہو وہاں کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ ایک حساس دل شاعر اس ماحول سے بے خبر رہے۔ ویسے بھی مظلوم کی مظلومیت کو سمجھ کر چپ سادھ لینا بھی ظالم کے ظلم میں شریک ہونے کے مترادف ہے۔ اس حوالے سے خورشید رضوی کی غزلوں میں جا بجا انسانیت کی کسمپرسی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

قفس کی تیلیاں کیا کم ہیں تنکوں سے نشیمن کے
قفس میں رہ کے پھر ہم کو تلاشِ آشیاں کیوں ہو

(امکان)

خورشید رضوی معاشرے میں موجود مختلف رویوں سے مکمل طور پر آگاہ ہیں۔ وہ اُس طریق سے آگاہ ہیں جس پر معاشرے کی اکثریت زندگی گزار رہی ہے۔ خورشید بخوبی جانتے ہیں کہ زیست پھولوں کی سیج نہیں ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں:

یہ زندگی ہے کسی کے مکاں کا سناٹا
ہم انتظار میں ہیں اور وہ گیا ہوا ہے

(دیریاب)

خورشید رضوی کا مشاہدہ ان کی شاعری کا بنیادی وصف ہے۔ وہ جس خوبصورتی سے اپنے مشاہدات کو شاعری کی زبان میں بیان کرتے ہیں یہ انہی کا خاصہ ہے۔ وہ زندگی کے تلخ تجربات اور حسین لمحوں دونوں کو خانہ ادراک میں محفوظ رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک گروہی زندگی میں یکجا ہونا بہت ضروری ہے۔ اس سے سماجی طاقت میں اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن انہیں ایسا نظر نہیں آتا۔

ہجوم ٹوٹتا جاتا بکھرتا جاتا ہے
کہ دل کٹے ہوئے ہیں ، راستہ بٹا ہوا ہے

(دیریاب)

زندگی گزری بہت پُر لطف بھی ، سنسان بھی
سردیوں کی رات کی تنہا مسافت کی طرح

(دیریاب)

خورشید سماج میں محنت کشوں کے حامی ہیں۔ ان کے نزدیک اس شخص کی اہمیت اور معاشرے کے لیے

اُس کا کردار زیادہ اہمیت کا حامل ہے جو اپنے ایامِ طفولیت معاش کے حصول کے لیے تگ و دو کرتے ہوئے گزار دیتا ہے۔

میں شب و روز کا حاصل اسے لوٹا دوں گا
وقت اگر میرے کھلونے مجھے واپس کر دے

(سرابوں کے صدف)

ہمارے سماج کا اجتماعی المیہ یہ ہے کہ ہم نے سماجی اقدار کو برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ہم نے کسی ضابطہ حیات کا پاس نہیں رکھا۔ ہمارے لوگوں کی مثال ایسے قافلے کی ہے جو بغیر رختِ سفر عازمِ سفر ہیں۔ جن کو منزل کی خبر بھی نہیں مگر پہنچنے کی دُھن بھی سوار ہے۔ یہ کیفیت خورشید رضوی اپنے انداز میں بیان کرتے ہیں۔

زندگی کٹتی چلی جاتی ہے اس کا نہیں رنج
رنج یہ ہے کہ کبھی ڈھنگ سے زندہ نہ رہے

(سرابوں کے صدف)

خورشید رضوی کے ہوں سماجی شعور کی جھلکیاں بہت نمایاں ہیں مگر وہ کسی وقتی تحریک یا ہیجان کا نتیجہ معلوم نہیں ہوتی ہیں وہ نہایت چابکدستی سے اپنا مافی الضمیر بیان کرتے ہوئے آگے نکل جاتے ہیں۔ خورشید رضوی زندگی کے تلخ تجربات کو لطیف پیرائے میں بیان کرتے ہیں تا کہ وہ قاری کے خیالات پر گراں نہ گزرے۔ ان کی شاعری میں بے ہنگم ماحولیاتی عناصر کا تذکرہ اس کیفیت میں موجود ہے جیسے ایک رہنما ہر قیمت پر اپنی اقتدا میں آنے والے لوگوں کی معاشرتی مشکلات کا حل چاہتا ہو لیکن اُس کی پریشانی میں قنوطیت کا رنگ نہیں ہوتا۔ بلکہ امید کا دامن کبھی بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ واہموں اور حقیقتوں کے تضاد سے پیدا ہونے والی انسانی زندگی کی بنتی بگڑتی صورتحال اور جذبات کے اُتار چڑھاؤ کو بیان کرنے میں ہچکچاتے نہیں ہیں۔ خورشید رضوی فرد کی فلاح کے حامی ہیں۔ ان کے نزدیک فرد میں ظاہر و باطن کا تضاد نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ فرد کا مستقل نفاق رویہ اجتماعی روش اختیار کر جاتا ہے۔ جس کے اثرات معاشرے پر پڑتے ہیں۔ فرد کے اجتماعی رویوں پر ہی اس کی روزمرہ کی حالت موقوف ہے۔ خورشید ہر حال میں فرد کے حامی ہیں۔ اس معاملے میں وہ خدا سے بھی سوال کرتے ہوئے نہیں ہچکچاتے۔

کیوں پہاڑوں کو امانت سے سبکدوش کیا
آدمی پر غم و آلام کی یورش کیوں ہے؟

خورشید کے نزدیک ظاہری نمود و نمائش معنی نہیں رکھتی۔ ان کے نزدیک ایسے افراد کو پذیرائی ملنی چاہیئے جو محنت کرتے ہیں۔ لیکن ہمارا سماجی سسٹم بالکل اُلٹ سمت میں رواں دواں ہے۔

خون ہے جن کا جگر خود کو چھپاتے کیوں ہیں
جو ہے بے رنگ انہیں ذوقِ نمائش کیوں ہے؟

(دیریاب)

یہ زمانہ ہے یہاں سب ہے چلن پر موقوف
ابنِ منصور کو منصور کہا جانے لگا

(دیریاب)

خلق نے کھیت پہ بارش کی دعا مانگی تھی
ابر گلیوں میں گرجتا ہوا پانی لایا

(دیریاب)

سماج میں پھیلتی ہوئی مابعد الطبیعاتی بحثیں اور تصوف کے دائرے جو بعض اوقات ایک ہی تصویر کے دو رُخ نظر آتے ہیں۔ ہمارے عہد میں اکثر و بیشتر شعراء نے اس عمیق و دقیق موضوع کو بطور نمائش اپنایا ہے، جب کہ یہ ایسا حساس موضوع ہے کہ اس پر عدم دسترس کلام میں غیر یقینی کی صورتحال پیدا کر دیتی ہے۔ البتہ خورشید رضوی نے ان موضوعات کو داخلی کیفیات کے پیرائے میں بیان کیا ہے

میں تیرا آئینہ ہوں مجھے ٹوٹنے نہ دے
میں رائیگاں ہوا تو سمجھ رائیگاں ہے تو

(دیریاب)

خورشید رضوی دقیق فلسفیانہ مسائل کو بھی اپنے انداز میں بیان کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔

چشمِ عیاں تو خیر ہمیشہ سے تھی زبوں
یہ کیا ہوا کہ چشمِ نہاں سے نہاں ہے تو

(دیریاب)

پہنچے جب ان کے پاس تو اپنا پتہ نہ تھا
ہستی تمام راہِ طلب میں بکھر گئی

(دیریاب)

خورشید نے زندگی بھر ایسے افراد پر تنقید کی ہے جنہوں نے مذہب کو اپنی نفسانی خواہشات کا آلہ کار بنایا اور معاشرے میں تفرقہ بازی کو فروغ دیا۔ مذہب کے معاملے میں انکی سوچ محدود نہیں بلکہ آفاقی ہے۔ وہ عالمانہ ذہن کے مالک ہیں اس لیے زندگی کے تمام معاملات پر غور وفکر کرتے ہیں جس کا اظہار انکی غزلیات میں موجود ہے۔ خورشید رضوی کی غزلیات میں ایک پہلو اپنے اطرافِ معاشرہ میں معیارِ علم کو بلند کرنا ہے تا کہ نہ صرف سماج میں ترقی کی راہیں کھلیں بلکہ عوام بھی اس تک رسائی حاصل کر سکیں اور بلا شبہ سماج کی ترقی عوام کی ترقی ہے۔ آج کل کے میکانکی دور میں یہ سب کچھ علمی ترقی کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ خورشید رضوی کی غزلیات اور ان کے علمی و ادبی کارنامے اس اعتبار سے بھی اہمیت کے حامل ہیں کہ ان کے اثرات انسان اور سماج دونوں پر موجود ہیں۔

خورشید رضوی ایسے زمانے کے شاعر ہیں جہاں جا بجا نت نئی ادبی و لسانی ایجادات منظر عام پر آ رہی ہیں مگر خورشید رضوی نے اپنی شاعری کو تخیل کی بلند پروازی تو بخشی لیکن لفظی شعبدہ بازی، لسانی اور ہیئتی تجربوں سے دور ہی رکھا۔ جس کا اثر یہ سامنے آیا کہ خورشید رضوی سنجیدہ ذہنوں تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ موجودہ دور میں خورشید رضوی کے کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کا تعلق ادبی روایت سے نہیں ٹوٹتا۔ جس کے متعلق ڈاکٹر سہیل احمد خان کہتے ہیں:

> ''خورشید رضوی رسمی شاعر نہیں بلکہ ان کا شمار اُن جدید شعراء میں ہوتا ہے جو غزل کی پوری روایت کو اپنے اندر جگہ دے کر اور اپنے زمانے کے رجحانات کو ساتھ ملا کر ایک نیا رنگ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس لحاظ سے خورشید رضوی جدید شاعری میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں''۔ [۱۴]

پھر آج اپنے گریباں میں غوطہ زن ہو لیں
پڑی ہیں جو تہِ دل میں وہ سیپیاں کھولیں

میں اُس مکاں میں جس میں پکاریے تو کہیں
کوئی جواب نہ دے اور بام و در بولیں

(شاخِ تنہا)

خورشید رضوی کی شاعری میں مقصدیت کا عنصر بھی نمایاں ہے۔ کیوں کہ خورشید رضوی کی غزلوں کے مطالعے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے۔ آپ ادب کو سماج میں بہتری لانے کے طور پر استعمال کر رہے ہیں نہ کہ محض وقتی

حظ اُٹھانے کے لیے اور واہ واہ کے شور تک محدود کر رہے ہیں۔ خورشید رضوی اس امر سے بخوبی واقع ہیں کہ ایک بڑا شاعر ہی لفظ کو نیا مزاج عطا کرتا ہے یہ مزاج موجود زمانے کے مزاج اور سماجی حالات سے وجود میں آتا ہے۔ جن الفاظ کو ادیب ایک نئے خیال کے ذریعے استعمال کرتا ہے وہ مل کر ایک رجحان تشکیل دیتے ہیں اور یہی تشکیل پانے والے رجحانات ہی سماجی ارتقاء میں اپنا کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔

لفظ مل کر الفاظ بناتے ہیں اور الفاظ سے مل کر زبان تشکیل پاتی ہے اور زبان معاشرتی روابط میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے کیوں کہ انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق کا ہی ہے۔ قوتِ ناطقہ سے اظہار کو وجود ملتا ہے اور اس سے احساس و جذبات منصۂ شہود پر آتے ہیں۔

بولوں تو باز گشت برابر کا دے جواب
ایسا پہاڑ ہو تو غمِ دل سناؤں میں

(سرابوں کے صدف)

کسی تخلیق کار کی تخلیق کو جانچنے کے لیے سب سے اہم اور بنیادی قائدہ یہ ہے کہ فن پارے کو اس زاویے سے دیکھا جائے کیا کہا گیا ہے؟ اور کسے کہا گیا ہے؟ اگر ژرف نگاہی سے دیکھا جائے تو 'کیا' اور 'کیسے' سماج کے ہی پہلو ہیں۔ جب ایک تخلیق کار اپنے جذبات و خیالات کا اظہار کرتا ہے اس اظہار کے لیے وہ خام مال اپنے سماج سے اکٹھا کرتا ہے۔ سماج کے اندر مذہب، اخلاقیات، اقدار کا خیال رکھا جائے گا تو معاشرے میں پروان چڑھنے والا فرد بھی عین اسی اجتماعی رویے کی پاسداری کرے گا اور اس ورثے کو آنے والی نسل کو منتقل کرے گا۔ لیکن اگر بات اس کے برعکس ہوگی تو افراد کا رویہ بھی اس کی مانند ہوگا۔

مرے عزیز وطن کی فضا نے بھر دی ہے
مری سرشت کے اندر منافقت کیا کیا

(شاخِ تنہا)

معصوم طائروں کے لیے دل گرفتہ ہوں
ان کو بھی آدمی کا عمل مار جائے گا

(رائگاں)

یہ بنیادی تصورات اس کے ماحول کے عکاس ہیں۔ جب وہ ابتدائی تخلیات سے نشوونما پاتے ہوئے تصورات کو جب لفظی پیرہن عطا کرتا ہے تو ان کے نتائج دوبارہ سماج سے اخذ ہوتے ہوئے اثر انداز ہوتے ہیں

۔خورشید رضوی نے بھی اپنی غزلیات کے موضوعات کو اردگرد کے ماحول سے مجتمع کیا ہے۔آپ ایک معلم کے درجہ پر عرصہ دراز سے فائز ہیں ۔ ایک معلم کے لیے یہ بات سب سے زیادہ ضروری ہے کہ وہ ماہر مضمون ہونے کے ساتھ ساتھ ماہر نفسیات بھی ہو۔خورشید رضوی شعبہ تدریس سے وابستہ ہونے کے ساتھ ساتھ ادب کی آبیاری کرتے نظر آتے ہیں ۔آپ نے اپنی اس تدریسی زندگی اور ادبی زندگی کے ملاپ سے ایک ایسی فضا تخلیق کی ہے جو محض ادب ہی نہیں بلکہ انسانی نفسیات کا آئینہ بن گئی ہے۔آپ نے جس عمیق نگاہی سے انسانی رویوں کا جائزہ لیا ہے اور پھر اس کا ذکر مشاہداتی انداز میں بیان کیا ہے یہ ایک خوش کُن اضافہ ہے۔خورشید رضوی اردگرد ہونے والی روزمرہ کی تبدیلیوں اور شب و روز کے نشیب و فراز میں بھٹکتے ہوئے انسانوں کا مشاہدہ کرتے ہیں اور بعدازاں اس سے منسلک افراط و تفریط کو اپنا دُکھ سمجھ کر سپردِ قرطاس کرتے ہیں۔خورشید رضوی کی غزلیات میں عام آدمی کا دُکھ نمایاں نظر آتا ہے۔خورشید رضوی کی غزل میں سماجی بے راہ روی کو درست کرنے کی گونج واضح سنائی دیتی ہے۔آپ کی غزل سماجی ناہمواریوں ، طبقاتی کشمکش ،اختراعی روایات اور نام نہاد اقدار کے بوجھ تلے کراہتے ہوئے انسانوں کے لیے امید کی کرن ہے۔

خورشید رضوی جدید ادبی عہد میں رہتے ہوئے قدیم کلاسیکی شعری روایت سے منسلک نظر آتے ہیں ۔خورشید رضوی نے جدید رجحانات کو اپنی شاعری کا موضوع ضرور بنایا ہے لیکن اس میں ایک ادبی فرق نمایاں ہے۔خورشید رضوی سماجی مسائل اور معاشرتی ضرورتوں کے بیان کو شعری محاسن کا ہمسفر اس انداز سے بناتے ہیں کہ مسائل کا بیان اجنبی معلوم نہیں ہوتا۔خورشید رضوی کی شاعری میں عہدِ نو میں دم توڑتی ہوئی اقدار اور ختم ہوتی ہوئی تہذیب و ثقافت کا المیہ موجود ہے۔

حیات و مرگ و طلوع و غروب ہے دنیا
کہ پر سمیٹتا ہے کوئی ، تولتا ہے کوئی

(شاخ تنہا)

زمیں قاہر بھی ہے ظالم بھی ہے اور بے اماں بھی ہے
پرندوں کے جسد بھی خاک میں آسودہ دیکھے ہیں

بھرے جہاں سے الگ ہو کے ہم کلام رہے
مدام میں، مرا سایہ، اداس ، آپس میں

خورشید رضوی اہلِ دل ہونے کے ساتھ ساتھ اہلِ نظر بھی ہیں۔ وہ عقل کی بات بھی دل سے کرنے

کے خواہاں ہیں۔ ان کے کلام میں سماج میں کم ہوتی ہوئی اقدار اور محبت کا غم موجود ہے۔ خورشید رضوی عشق کو پاکیزگی کی علامت سمجھتے ہیں۔

شروع سے ہی انسان کے قائم کردہ معاشرے میں انسان کا بنیادی مسئلہ معاش کا مسئلہ رہا ہے، ہماری کلاسیکی شعری روایت سے تا حال ہر شاعر نے اپنے انداز میں انسان کے اس بنیادی مسئلہ کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ خورشید رضوی نے اس بنیادی مسئلے کو اپنے انداز میں یوں بیان کیا ہے۔

دل میں خوابِ حسین ، ذہن میں اندوہِ معاش
اور دروازے پہ ایام کی پیہم دستک

(امکان)

خورشید رضوی اپنی غزل کو معاشرتی مسائل کا نوحہ نہیں بناتے بلکہ رومانویت سے اس میں تازگی کی فضا پیدا کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر جو سب سے اہم بات خورشید رضوی کو دیگر شعرا و ادبا سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ رومانویت کے اظہار میں بھی حقیقت سے دامن نہیں بچاتے بلکہ دامن گیر رکھتے ہیں۔

یہی ہے عشق کہ سر دو مگر دہائی نہ دو
وفورِ جذب سے ٹوٹو مگر سُنائی نہ دو

(شاخِ تنہا)

خورشید رضوی کا یہ خاصہ ہے کہ وہ سماجیات کے بیان میں اس قدر گم نہیں ہوتے کہ اپنا مافی الضمیر بیان نہ کریں۔ ان کا سماجی مشاہدہ بہت گہرا ہے وہ اس مشاہدے کے بیان میں نہیں کتراتے بلکہ وہ جس موضوع کو بھی بیان کرنا چاہتے ہیں اس کا حق ادا کرتے ہیں۔

اس جہاں کے تو ہے شایاں صرف مرنے کی اُمنگ
لغو ہے کتنی یہاں کچھ کر گزرنے کی اُمنگ

(شاخِ تنہا)

آنکھ کھلنے پر ملے شاید مُرادوں کا جہاں
چند صدیوں تک کہیں غاروں میں سونا چاہیئے

خورشید رضوی اس معاشرے کو مستقبل سنوارنے کا مشورہ دینے کے ساتھ ساتھ فی الوقت میسر خوشگوار لمحوں، نعمتوں پر قناعت کا مشورہ دیتے ہیں کیونکہ وہ ان بات سے آگاہ ہیں کہ ''الانتظار اشد من الموت'' (انتظار

موت سے زیادہ سخت ہوتا ہے ۔) خورشید رضوی خوابوں کی سولی پر خیال کو لٹکانے کی بجائے اسے جذبات و احساسات کو قابو رکھنے کا مشورہ دیتے ہیں ۔

مآل کار قناعت ہے سو ابھی سے سہی
وگرنہ طولِ تمنا کی انتہا بھی نہیں

(شاخِ تنہا)

خورشید رضوی کا کلام ہر حوالے سے اپنے عہد کی آواز ہے ۔ان کے ہاں شاعری نہ تو بے ہنگم شور کی مانند ہے کہ جس کو مسلسل سُن کر سماعتیں تھک جائیں اور نہ ہی ایسا سکوت کہ جس سے دل دہل جائے ، بلکہ ان کی شاعری اُس آواز کی طرح ہے جو ہر خوابیدہ ذہن کو تازگی بخشتی ہے اور مائل بہ عمل کرتی ہے ۔خورشید رضوی کی شاعری میں جدید و قدیم روایات کا حسین امتزاج ہی اس مادی دور میں ان کو دیگر اہلیانِ قلم سے ممتاز کرتا ہے ۔ان کے کلام میں موجود متنوع خیالات قاری کو تحرک کی ترغیب دیتے ہیں ۔عموماً شاعروں پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ شاعر کی زندگی عمل سے عاری ہوتی ہے ۔خورشید رضوی کی زندگی کے تحرک کا اندازہ ہمیں ان کی شاعری کے استعاراتی نظام میں موجود حرکی استعاروں سے ہوتا ہے جو ان کی شخصیت ، تخیل اور عمل کی قوت کو واضح کرتا ہے ۔خورشید رضوی کا خاصہ یہ ہے کہ وہ نہ تو اپنی شاعری میں خارجیت سے رشتہ توڑتے ہیں اور نہ ہی خارجیت سے بے خیالی برتتے ہیں بلکہ دونوں کو ضرورت و اہمیت کے تحت بیان کرتے چلے جاتے ہیں ۔ خارجی علائم کو داخلی مضامین میں ایسے استعمال کرتے ہیں جس کی مثال کہیں نہیں ملتی ۔ معاملاتِ عشق خالصتاً داخلی معاملات ہوتے ہیں جن کو سمجھانا یا سمجھنا تو کجا بیان کرنا بھی ہر کسی کے بس کی بات نہیں مگر ان کی شاعری میں عشق کو خود سمجھ کے دوسروں کو سمجھانے کا کام بہ طریقِ احسن سرانجام دیا گیا ہے ۔

تم سمجھتے ہو بچھڑ جانے سے مٹ جاتا ہے عشق
تم کو اس دریا کی گہرائی کا اندازہ نہیں

ان سے مل کر بھی کہاں مٹتا ہے دل کا اضطراب
عشق کی دیوار کے دونوں طرف سایہ نہیں

(شاخِ تنہا)

حوالہ جات

۱۔ معین الدین عقیل، پاکستانی غزل (تشکیلی دور کے رویے اور رجحانات)، ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، کراچی، ۱۹۹۷ء، ص ۱۶

۲۔ عالم خان، ڈاکٹر، بحوالہ پریا تا بپتا، 'عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو' مطبوعہ ادبیات، منیر نیازی نمبر، شمارہ ۸۴، ۸۳، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۲۸۱

۳۔ معین الدین عقیل، پاکستانی غزل (تشکیلی دور کے رویے اور رجحانات)، ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، کراچی، ۱۹۹۷ء، ص ۱۷

۴۔ ایضاً، ص ۲۰

۵۔ خورشید رضوی، ڈاکٹر، خودنوشت، مشمولہ: ارمغانِ خورشید، مولف، ڈاکٹر زاہد منیر عامر، پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۱۵ء، ص ۴۱

۶۔ حسن عسکری کاظمی، پروفیسر، خورشید رضوی کے شعری آداب، مشمولہ: ارمغانِ خورشید، مولف ڈاکٹر زاہد منیر عامر، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۱۵۴

۷۔ نوید صادق، فن ہے فن آخر، مشمولہ: ارمغانِ خورشید، مولف ڈاکٹر زاہد منیر عامر، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۱۶۸

۸۔ منیر نیازی، خورشید رضوی کی شاعری، مشمولہ: ارمغانِ خورشید، مولف ڈاکٹر زاہد منیر عامر، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۱۰۷

۹۔ احمد ندیم قاسمی، بیک کور یکجا (کلیات)، خورشید رضوی، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، اشاعتِ دوم، ۲۰۱۲ء

۱۰۔ فاروق مونس، خورشید رضوی کی غزل، مشمولہ: فنون، مدیر احمد ندیم قاسمی، شمارہ ۱۹، جنوری تا اپریل، ۲۰۰۳ء، ص ۱۰۳

۱۱۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، دیباچہ (شاخِ تنہا)، یکجا (کلیات)، خورشید رضوی، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۱۱

۱۲۔ منیر نیازی، خورشید رضوی کی شاعری، رائگاں، یکجا (کلیات)، خورشید رضوی، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۱۱

۱۳۔ محمد زکریا، خواجہ، خورشید رضوی اور شاخِ تنہا، مشمولہ: ارمغانِ خورشید، مولف، ڈاکٹر زاہد منیر عامر،

پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۱۵ء، ص ۱۱۳

۱۴۔ سہیل احمد خان، ڈاکٹر، مشمولہ: ارمغانِ خورشید، مولف، ڈاکٹر زاہد منیر عامر، پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۱۵ء، ص ۱۰۰

باب سوم

خورشید رضوی کی غزل میں تاریخی و تہذیبی شعور

۱۔ خورشید رضوی کی غزل میں تاریخی شعور

۲۔ خورشید رضوی کی غزل میں تہذیبی شعور

۱۔ خورشید رضوی کی غزل میں تاریخی شعور:

تاریخی شعور دراصل تاریخ اور اس کے عناصر کی مکمل آگاہی کا نام ہے۔ جو افرادِ معاشرہ میں موجود ہوتی ہے۔ تاریخ کا وجود انسان کی ابتدا سے ہی ہے۔ تاریخ میں گزشتہ زمانوں کے ارتقائی عمل کی داستان اس میں ہونے والی سماجی تبدیلیوں، اس میں آنے والے قابلِ ذکر واقعات، افراد کے انفرادی و اجتماعی کارنامے اور ان کے اثرات کا ذکر موجود ہوتا ہے۔ یہاں تاریخ سے متعلق مختلف نظریات کو دہرانا مقصود نہیں ہے۔ حقیقت میں دیکھا جائے تو تاریخ، تہذیب اور انسان ساتھ ساتھ سفر کرتے ہیں۔ سب کی بقاء ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہے۔ سبطِ حسن کہتے ہیں:

> قومیں فنا ہو جاتی ہیں مگر نئی نسلوں کے طرزِ معاشرت پر صنعت و حرفت پر سوچ کے انداز پر اور ادب و فن کے کردار پر ان کا اثر باقی رہتا ہے۔ زبانیں مُردہ ہو جاتی ہیں۔ لیکن ان کے الفاظ، محاورے، علامات و استعارات نئی زبانوں میں داخل ہو کر ان کا جُز بن جاتے ہیں۔ پرانے عقائد کی خدائی ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن نئے مذہب کی ہر آستین میں عمامہ و دستار کے ہر پیچ میں پُرانے بُت پوشیدہ رہتے ہیں۔ تہذیبیں مٹ جاتی ہیں لیکن ان کے نقش و نگار سے نئی تہذیبوں کے ایوان جگمگاتے رہتے ہیں''۔ [۶]

تاریخ ہمارے اندر کسی نہ کسی انداز میں موجود رہتی ہے۔ وہ تہذیبی اقدار کی پاسداری کی شکل میں بھی ہوسکتی ہے۔ وہ یادوں کے خزانوں کی شکل میں بھی ہوسکتی ہے۔ گویا تاریخ ہمارے عقیدے و احساس کی شکل میں ہمارے نفسیاتی عمل میں اپنی جڑیں مظبوط رکھتی ہے۔

تاریخ تہذیب اور معاشرتی تغیر کے رشتوں نے ہر انسانی عمل کو اجتماعی طور پر نہ صرف محسوس کیا بلکہ اس کے مشاہداتی انداز کو محفوظ بھی رکھا۔ انسان کے عقلی نہاں خانوں میں اس کو محفوظ رکھنا اظہار کی جانب رغبت کا سبب بنتا ہے۔ جب بھی اس کا اظہار مخصوص تخلیقی عمل کے ذریعے کیا جاتا ہے تو معاشرے میں فکری راہیں استوار ہوتی ہیں۔

برصغیر کا تاریخی ورثہ فنونِ لطیفہ میں محفوظ ہے۔ یہ اسی کی بدولت نسل در نسل آگے بڑھ رہا ہے۔ فنونِ لطیفہ میں سب سے زیادہ شاعری کی روایت ہے۔ جس سے ہمیں تاریخی آگاہی ملتی ہے۔ ہمیں مختلف زمانوں میں ہونے والی سیاسی، معاشرتی، علمی و ادبی تبدیلیوں کے متعلق معلومات فراہم ہوتی ہیں۔

۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کی تاریخی فضا مسلسل انتشار میں نظر آتی ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں

ہونے والی سیاسی وسماجی اکھاڑ پچھاڑ اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اجتماعی احساس کی تصویر کشی مخصوص انداز میں 'مسدس حالی (مدوجزر اسلام)' میں ملتی ہے۔ مسلمانانِ برصغیر چونکہ حالات کے سبب مسندِ اقتدار سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے تو مکمل طور پر احساسِ کمتری نے انہیں جکڑ لیا۔ جس سے نکلنے کا ایک موثر ذریعہ عظمتِ رفتہ کا دہرانا تھا۔ تاکہ دوبارہ سے اپنی معاشرتی ساکھ کو بحال کر سکیں۔ بیسویں صدی میں یہی کام حالی کے بعد سب سے زیادہ اقبال کے ہاں نظر آتا ہے۔ جنہوں نے مسلمانوں کی بیداری میں اہم کردار ادا کیا۔ جس کا نتیجہ ۱۹۴۷ء میں آزادی کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

خورشید رضوی کی غزلیات میں ہمیں ان کے مخصوص انداز میں تاریخی شعور کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔ تاریخ سے ان کی وابستگی بہت گہری ہے۔ وہ ہر لحاظ سے انسانی تاریخ کے عالم ہیں۔ انسان کے مختلف نظریوں کی تاریخ بھی ان کے پیشِ نظر ہے۔ مختلف معاشروں ان کی تہذیب وثقافت، زبان وادب کا مطالعہ ان کے لیے وقت کا بہترین مصرف ہے۔ عرب معاشرے اور قبل از اسلام و بعد از اسلام کی تاریخ کے ساتھ ساتھ وہ اپنے خطہءِ ارض برصغیر کے تاریخی حقائق سے بخوبی آگاہ ہیں۔

کانٹوں سے بھرے بن میں رستے کی بنا ڈالی
دے دے کے لہو طرح نقشِ کفِ پا ڈالی

(شاخِ تنہا)

انسان ہمیشہ اپنے موجودہ حالات کا موازنہ تاریخی حالات سے کرتا ہے۔ جن سے وہ سبق حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اگر حالات ماضی کی خونریزی کی یاد دلائیں تو دل افسردگی کے اندھیروں میں ڈوبنے لگ جاتا ہے۔

پھر آج ہواؤں کو مطلوب ہے خونریزی
بادل کی زرہ پہنی، شمشیرِ صبا ڈالی

(شاخِ تنہا)

حالات واقعات میں تسلسل انسان کے اندر ایک مخصوص کیفیت پیدا کرتا ہے۔ ہماری ڈیڑھ سو سالہ تاریخ میں پرمسرت واقعات کا تسلسل نہایت کم ہے۔ مسلسل رنج والم کی داستانیں موجود ہیں۔ جو طبیعت میں حزن وملال کا رنگ بھر دیتی ہیں۔

دوستو میری طبیعت کا بھروسہ کچھ نہیں
ہنستے ہنستے آنکھ میں رنگِ ملال آ جائے گا

(شاخِ تنہا)

وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ بڑے سے بڑا گھاؤ بھی وقت کے ساتھ سوئے اندمال آجاتا ہے۔ خورشید اس تجربے کو مخصوص انداز میں کہتے ہیں۔

حادثہ یہ ہے کہ ساری ذلتوں کے باوجود
رفتہ رفتہ زخم سوئے اندمال آ جائے گا

(شاخِ تنہا)

ترے بغیر بھی کٹتی رہی ذرا نہ رکی
شکایتیں مجھے عمرِ گریز پا سے ہیں

(شاخِ تنہا)

انسان تلاشِ امن میں سرگرداں رہتا ہے۔ لیکن بعض دفع ماضی کی تلخ یادیں خوف کو جنم دیتی ہیں خورشید کے ہاں بھی ماضی کی ان تلخ یادوں کا اظہار ملتا ہے:

کٹ گیا دورِ خزاں فصلِ بہار آ بھی گئی
دیکھتے ہیں اب ہمیں کس بات کا دھڑکا لگے

(شاخِ تنہا)

بڑا شاعر ہمیشہ معاشرے کے دُکھ کو اپنا دُکھ تصور کرتا ہے۔ وہ ہر فرد کے ساتھ شریکِ غم رہتا ہے۔ خورشید رضوی بھی اس بات کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ دنیا کے کسی بھی شخص کے غم کو جدا تصور نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک انسانی جان بہت قیمتی ہے۔ چاہے وہ مغرب میں ہو یا مشرق میں۔

مجھ کو اپنی ذات کے ٹکڑے نظر آتے رہے
انجمن میں جو بھی تھا ٹوٹا ہوا آئینہ تھا

(شاخِ تنہا)

خورشید رضوی اپنی ذات کی آگہی پر زور دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک جب انسان اپنے من کو ٹٹولتا ہے تو وہ ایسے خزانے نکال لاتا ہے جو معاشرے میں کام آتے ہیں۔

پھر آج اپنے گریباں میں غوطہ زن ہو لیں
پڑی ہیں جو تہہ دل میں وہ سیپیاں کھولیں

(شاخِ تنہا)

ہم نے تنہائی کی دھن میں ہائے کیوں چھوڑا وطن
اجنبی سب رفتہ رفتہ دیکھے بھالے ہو گئے

دیدنی تھی فصلِ گُل میں تندیءِ خونِ حیات
یاسمن کے پھول ، یوں سمجھو کہ لالے ہو گئے

(شاخِ تنہا)

خورشید تاریخ کے دھندلکوں میں چھپ جانے والے افراد کو یاد کرتے ہیں۔ان کے شعور میں ہمہ وقت گزشتگاں کے عکس موجود رہتے ہیں۔خورشید گزرے زمانے کے جذبوں کو بھولتے نہیں کبھی تو یہ باعثِ مُسرت ہے اور کبھی باعثِ اُداسی۔

آنکھ میں ہر لحظہ تصویریں رواں رہنے لگیں
جم گیا ہے خون سا اک دیدہ بے خواب میں

(شاخِ تنہا)

عہدِ رفتہ کے ولولوں کے نشاں
اک مسلسل سی بے کلی ہے فقط

(شاخِ تنہا)

ہوا جو دل کی طرف کل صبا کا روئے سخن
تڑپ اُٹھی مری نس نس میں آب جوئے سخن

کھلے جو زخم تو رہ رہ کہ یاد آنے لگے
وہ جن کے قُرب میں ہوتی رہی نموئے سخن

کبھی وہ دوست کہ تھے دست و ساعد و بازو
وہ ہم پیالہءِ احساس و ہم سبوئے سخن

وہ راز دار نگاہیں فصاحتوں کی امیں
وہ جن کے بعد نہ رہتی تھی جستجوئے سخن

(شاخِ تنہا)

خورشید تاریخ کے اوراق میں عظمتوں کو سینے میں مقید کیے ہوئے ہیں ان سے اپنی وابستگی ان الفاظ میں کرتے ہیں

دل آج بھی چراغ اُسی انجمن کا ہے
صدیاں گزر گئیں جسے زیر و زبر ہوئے

(شاخِ تنہا)

اسی سبب سے نہیں صلح آئینے سے مری
کہ میں کچھ اور ہوں اور میری زندگی کچھ اور

بحرِ انا ہوں میری تہوں میں اتر کے دیکھ
خوابیدہ مجھ میں وقت کی میت ہے تہہ بہ تہہ

(شاخِ تنہا)

خورشیدِ کی غزلوں میں تاریخی واقعات وحقائق کا نمایاں اظہار ملتا ہے۔

جھیلتا ہوں سختیاں رنگِ طبیعت کے خلاف
وقت کے ہاتھوں گدا ہوں ' اصل کا شہزادہ ہوں

(شاخِ تنہا)

تم تو کیا ہو سرِ دیوارِ زمانہ خورشید
رائگاں ہو کے مٹا نقشِ فضیلت کیا کیا

(شاخِ تنہا)

کوئی کر پائے تو ہے یہ بھی بڑی ہمت کا کام
مرقدوں پر بیٹھ کر گزرے ہوؤں کو سوچنا

(سرابوں کے صدف)

خون رلواتی ہے گزرے زمانوں کی شبیہہ
تھک گئیں آنکھیں تو غرقِ ساتگیں کر دی گئی

(ایضاً)

مقام جن کا مورخ کے حافظے میں نہیں
شکست و فتح کے مابین مرحلے ہم لوگ

(ایضاً)

زباں بریدہ و بے دست و پا سہی لیکن
ضمیرِ کون و مکاں میں برے بھلے ہم لوگ

(ایضاً)

مسافت کٹ چکی کب کی مگر در پیش ہے دل کو
سفر کے بعد اب یادِ سفر در پیش ہے دل کو

(ایضاً)

خورشید رضوی کہیں کہیں انقلابی انداز میں تاریخ کو دہراتے ہیں جس میں گھن گرج نمایاں دکھائی دیتی ہے۔خورشید مسلمانانِ عالم کی داستانِ فاخرہ کو یاد کرتے ہیں۔جس کی وجہ سے اُس زمانے کے لوگ ان کے نام سے بھی خوف کھاتے تھے۔جب کہ آج صورتحال اس کے برعکس ہے۔

ظاہر میں سرِ دہر سبک سر بھی رہے ہم
پر باطنِ ایام کو ازبر بھی رہے ہم

(رائگاں)

پھولوں کی طرح شاخ سے پھوٹے بھی کئی بار
رنگوں کی طرح خاک میں مضمر بھی رہے ہم

(رائگاں)

انسانی تاریخ کو تلخ حقیقتوں کا مجموعہ کہا جائے تو بے جا نہیں ہو گا۔ خورشید رضوی اس بات و بخوبی جانتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسان کا ماضی اُس مفلوک الحال شخص کے گھر کی مانند ہے۔ جس کی حالتِ زار کو دیکھ کر اس شخص کی زندگی کا اندازہ ہو جائے۔

اپنا گھر اپنا ہی گھر ہے جب اسے کھولو گے
درد و غم آن کھڑیں ہوں گے پذیرائی کو

(ایضاً)

نفسیاتی حوالے سے انسان خیال کی رو میں بہتا چلا جاتا ہے۔ جب کبھی ایسے حادثے، واقعے کے متعلق سوچا جائے جس کا انسان بذاتِ خود چشم دید گواہ رہا ہو تو کبھی بھی اس سوچ کی گرفت سے نہیں نکل سکتا۔

آہستہ اس لرزتے ہوئے پل پہ رکھ قدم
صدیوں کا انہدام ترے نام ہی نہ ہو

(ایضاً)

خورشید کہتے ہیں کہ انسان ایسے اشجار کی مثل ہے جو خزاں کے ظلم کے بعد بھی بہار میں ہرا بھرا ہو جاتا ہے۔

مری مثال پُرانے شجر کی ہے دل پر
ہزار داغ بہار و خزاں اُٹھائے ہوئے

(ایضاً)

تاریخ کے عمیق مطالعے کے بعد ایک عام انسان سے ہٹ کو جو سوچ کسی صاحبِ فہم کے ہاں جنم لیتی ہے کہ

یہ زمانہ ہے یہاں سب ہے چلن پر موقوف
ابنِ منصور کو منصور کہا جانے لگا

(دیریاب)

زمانے کو جو ہمیں ڈھالتا رہا ہے صدا
ہمارے رنگ میں ڈھلنا بھی چاہیئے کچھ کچھ

(امکان)

ہم وقت کے پار جا رہے ہیں
اے عمرِ گزشتہ تو کہاں ہے

(ایضاً)

بدحال سہی شہزادہ ہوں
پامال سہی الوند ہوں میں

(ایضاً)

جس طرح سمندر سے گزرتا ہے سفینہ
مجھ کو بھی گزرنا ہے جہانِ گزراں سے

(ایضاً)

ایسا زوال ہے کہ بلندی نہیں کہیں
مدت سے سرکشوں کے ہیں سر بھی جھکے جھکے

(ایضاً)

یہ کس کا زہر جدائی لہو میں تیرتا ہے
ہمیں تو کچھ بھی نہیں یاد کب جدا ہوئے ہم

(دیریاب)

خورشید جدید تصورِ وقت کے تناظر میں تاریخ کو دیکھتے ہیں

دلوں میں حیثیتِ رفتگاں بدل جائے
اگر یہ وہمِ زمان و مکاں بدل جائے

(ایضاً)

اس گرانی کی سکت ہی مرے کاندھوں میں نہ تھی
بھول کر ہاتھ میں آبا کی وصیت نہیں لی

(ایضاً)

کتنے ہنگاموں کا حاصل کتنی جنگوں مآل
خاک کے یہ تخت یہ خاموشیٔ دربارِ خاک

(ایضاً)

بجائے حسن اب تو محملوں میں گرد ہوتی ہے
زمانے وہ گئے جب گرد سے محمل نکلتے تھے

(ایضاً)

خورشید رضوی کی غزلوں میں تہذیبی و تاریخی شعور کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ خورشید نے اپنی غزلوں کے موضوعات کے لئے کوخمیر مال اکٹھا کیا ہے وہ ان کے عہد کے تہذیبی اور تاریخی ماحول کی نمائندگی کرتا ہے۔ خورشید کی غزلوں میں نہ صرف عہد حاضر کی تہذیب و ثقافت اور تاریخی تصویر دیکھنے کو ملتی ہے بلکہ وہ روایت ساتھ وابستہ رہ کر اپنے جداد کی تہذیب و ثقافت، تمدن اور تاریخ کو اپنی غزلوں کے موضوعات کا حصہ بناتے ہیں۔ عہد حاضر میں جس طرح سے قدیم تہذیب و ثقافت کے نقوش جدید انسان کے قلب و ذہن سے مٹتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کے مٹنے سے نہ صرف انسان اپنے آباؤ اجداد کی تہذیبی وراثت سے دور ہوتا چلا جا رہا ہے بلکہ وہ اپنے اسلاف کی تمام تر اخلاقی قدروں اور تعلیمات سے بھی دور ہوتا جا رہا ہے۔ خورشید اہل بصیرت اور حساس طبیعت کے مالک ہونے کی بناء پر اپنے معاشرے کے افراد کو اس تہذیبی اور تاریخی سرمائے کی طرف بار بار متوجہ کرواتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مختصر یہ کہ خورشید رضوی کی غزل ان کے اپنے عہد کی تہذیب و ثقافت اور تاریخی ماحول کی مکمل آئینہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ قدیم تہذیبی اور تاریخی ماحول کی بھی مکمل طور پر عکاسی نظر آتی ہے۔

۲۔ خورشید رضوی کی غزل میں تہذیبی شعور:

بنیادی طور پر تہذیب انسان کی اجتماعی زندگی کے رہن سہن، اُٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے اور بول چال کے ساتھ ساتھ عمل کا بھی نام ہے۔ انسان نے ہوش سنبھالنے سے منازل شعور تک آنے کا سفر مخصوص ماحول میں گزارا۔ بعد ازاں انسان نے جو ترقی کی ہے اس ترقی میں سب سے زیادہ انسانی شعور کو اہمیت حاصل ہے۔ جس کی وجہ سے بنیادی تبدیلی انسان کے روز مرہ کے امور میں ظاہر ہوئی۔ تہذیب دراصل اس شعوری رویے کا نام ہے جو انسان میں سب سے پہلے اس وقت بیدار ہوا جب انسان نے کائنات میں اپنی انفرادی تفہیم کا آغاز کیا۔ معاشرے کے ارتقا کے ساتھ ساتھ اس رویے نے بھی ارتقائی منازل طے کیں۔ انسان ہمیشہ سے خارجی عناصر سے اپنی زندگی گزارنے کے وسائل ڈھونڈتا آیا ہے۔ انسان نے ابتدائی ادوار سے لے کر آج کے سائنسی دور تک خارجی عوامل کی تفہیم و تسخیر میں اپنے وسائل کا استعمال کیا ہے۔ ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ دراصل انسانی شعوری رویوں پر خارجی اثرات کی وجہ سے جبلتی رویوں میں موجود احساس و جذبات کا وقت کے ساتھ راسخ ہو

جانا تہذیب ہے۔ ہر علاقہ اپنے اپنے تہذیبی عناصر کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور ان عناصر کو اقدار کا نام دیا جاتا ہے۔ ایک نسل سے دوسری نسل تک ان اقدار کا پہچانا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ بعض تہذیبی اقدار ہر معاشرے میں مشترک ہیں جیسے جھوٹ سے نفرت اور سچ کی جانب رغبت، اچھائی اور برائی کا تصور، احترامِ انسانیت، وغیرہ البتہ زبان، لباس، مذہب، کے متعلق تہذیبی رویے کروٹیں لیتے نظر آتے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں تہذیب سے مُراد زندگی کے ایسے افعال کا بجالانا بھی سمجھا جاتا ہے جن میں زندگی کا سنوارنا، اصلاح کرنا شامل ہے۔ جو لوگ انفرادی طور پر اقدار پر عمل پیرا ہوتے ہیں ایک تو انہیں معاشرے میں اچھی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے تو وہیں اجتماعی انداز میں اقدار کی پابندی مکمل معاشرے کو مہذب سے ملقب کرنے میں مدد دیتی ہے۔ ہم جس خطہ ارض سے تعلق رکھتے ہیں وہاں ہماری تہذیب کی نشونما مشترک اقدار کے نتیجے میں ہوئی جس کی وجہ ایسے سماجی حالات ہیں جہاں مختلف تہذیبی عناصر ایک ساتھ پنپ رہے تھے لہذا اُن کا ایک دوسرے کے ساتھ اختلاط کوئی انہونی بات نہیں تھی۔

برصغیر ہمیشہ سے پوری دنیا کے لوگوں کے لیے گزرگاہ بنا رہا ہے اور یہاں کی عوام مختلف لوگوں اور ان کی تہذیبوں کے زیر اثر پروان چڑھتے رہے ہیں۔ ایک گروہ جب ایک علاقے سے دوسرے علاقے کی جانب سفر کرتا ہے تو اپنی تہذیب کو بھی کسی نہ کسی انداز سے ساتھ لے کر جاتے ہیں۔ جب عرب برصغیر کی جانب عازم سفر ہوئے تو وہ بھی اپنی تہذیب ساتھ لائے۔ اسی طرح جب اور لوگ برصغیر کی جانب بڑھے تو اپنے اپنے رنگِ زندگی اس سرزمین کو دیتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ ایک وقت ایسا بھی برصغیر کی تاریخ میں موجود ہے کہ جب برصغیر کے قابض حکمران انگریز، رعایا ہندو اور مسلم، درباری زبان فارسی تھی گویا پانچ تہذیبوں کے نمونے بیک وقت یہاں موجود رہے۔ جس کا واضح اثر آج بھی ہمارے معاشرے میں موجود ہے۔

جو چیز معاشرے کو ایک دوسرے کے ساتھ منسلک کرتی ہے وہ معاشرے میں موجود اظہار کی زبان ہے۔ زبان ہماری تہذیب سے ہی جنم لیتی ہے۔ اس لیے زبان پر تہذیب کے اثرات نمایاں انداز میں موجود ہوتے ہیں۔ برصغیر کے اس مشترک تہذیبی معاشرے میں ''اُردو'' کا وجود اس کی دلیل ہے۔ ہماری تہذیب صوفیاء، جوگیوں، کی جذب و وجد کی مشترکہ امین ہے۔ اس میں بازار، خانقاہ، دربار تینوں معاشرتی اداروں کی نمائندگی موجود ہے۔ اسی طرح زبان میں بھی اس کی چاشنی ہمیں سننے کو ملتی ہے۔

ہر زبان میں موجود ادب اس معاشرے کی تہذیب کا عکاس ہوتا ہے۔ ہمارے ادب میں موجود نظم و نثر میں بھی اس کے بہت سے نمونے مل جاتے ہیں۔ برصغیر میں عربی و فارسی تہذیبی اثرات کے زیر اثر غزل کو

مقبول صنف کا درجہ حاصل رہا ہے۔ گو کہ ایک دور غزل شکن دور بھی گزرا لیکن غزل کی مقبولیت میں فرق نہیں آیا ۔غزل رمز و ایما کی زبان ہے جو اشاروں کنایوں میں بات کہنے کا فن ہے غزل گو انہی اشاروں کنایوں کی مدد سے اپنے سامع کو حصار میں محصور کرتا ہے۔غزل میں معنی کی تفہیم الفاظ کے بردوں میں مستور ہوتی ہے۔غزل میں حقیقت کا عقدہ بھی کھُلے گا تو وہاں ساغر و مینا کی باتیں بھی ہوتی ہیں، بقول غالبؔ :

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے ساغر و مینا کہے بغیر

غزل چشمِ تماشہ سے چشمِ تمنا کا سفر پلک جھپکنے میں طے کرتی ہے۔غزل کے موضوعات میں ہمارا تہذیبی تنوع پایا جاتا ہے۔اس لیے غزل میں ہمیں خوشی وغم، فتح وشکست، زندگی وموت، کے بیانات اپنی مکمل رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر نظر آتے ہیں۔غزل لطافت سے بھرپور صنف ہے، خیال کی نُدرت، بیان کی چُستی کی بدولت اس کی مقبولیت آج بھی قائم و دائم ہے۔اُردو غزل میں ہماری تہذیب کے عناصر نمایاں انداز میں موجود ہیں۔ ہمارے معاشرتی حالات سے لے کر عالمِ تنہائی میں قلبی جذب کی کیفیات تک کا بیان ہمیں غزل میں ملتا ہے۔میرؔ و غالبؔ سے لے کر اقبالؔ اور عہد و حاضر کے سب شاعروں نے اپنے اپنے انداز میں اپنی تہذیبی روایت کو برقرار رکھا ہے۔

خورشید رضوی اسی تہذیبی ورثے کے امین ہیں اور مُشترکہ تہذیب کے وارث ہیں۔خورشید رضوی کی غزل میں تہذیبی شعور کے آثار بہت نمایاں ہیں۔ گو کہ خورشید رضوی زمانی اعتبار سے جدید دور سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان کی غزل جہاں ان کے عصر سے وابستہ ہے وہیں تہذیبی روایت کی بھی آئینہ دار ہے۔خورشید رضوی نے رمز و ایما کے فن کو خوب نبھایا ہے اور اظہار کرتے ہوئے اسے بالکل سپاٹ انداز میں بیان نہیں کیا بلکہ تخیل کو الفاظ کے دبیز پردوں میں مستور کر کے قرطاس کے سپُرد کیا ہے۔خورشید رضوی کی غزل میں روایت و حقیقت ساتھ ساتھ چلتے ہیں وہ حقیقت سے پہلو تہی نہیں کرتے۔

مذہب ہماری تہذیبی اکائی ہے۔ مذہب سے وابستگی منقسم زندگی کو ایک مرکز کی جانب رہنمائی کرتی ہے۔ خورشید رضوی عربی زبان و ادب سے گہری وابستگی رکھتے ہیں۔لہذا مذہب سے ان کا رابطہ ناگزیر ہے۔مگر خورشید ایک شاعر کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں اور شاعری کی دنیا میں 'تنہائی'، 'رائیگانی'، 'سراب' کے الفاظوں کا استعمال اور ان کیفیات کو اپنے انداز میں بیان کرنا ان کی داخلی کیفیات کا پتہ دیتا ہے۔ داخلیت کے دبستان میں 'دل' مرکز تصور کیا جاتا ہے۔خورشید کی شاعری میں خارج کی دنیا سے داخلی دنیا تک کا سفر دل کی مرہونِ منت

ہے۔'دل' کو خورشید نے اپنی غزلیات میں بہت مقامات پر بطور استعارہ استعمال کیا ہے۔ کہتے ہیں:

غمِ دنیا، غمِ دیں، عشق و ہوس، جذب و خرد
ہر سمندر میں ہیں دو چار سفینے دل کے

(سرابوں کے صدف)

معاشرے میں سانس لینے والا ہر شخص اپنی تہذیب سے کسی نہ کسی حد تک ضرور محبت کرتا ہے اور شاعر کے ہاں کیوں کہ احساس کی کیفیات عام انسان سے زیادہ ہوتی ہیں تو اس کی وابستگی بھی عام لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ خورشید رضوی بھی شعراء کے اُس قبیل سے ہیں جو تہذیبی روایت کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ وہ ان کی حفاظت کے لیے جان تک کی بازی لگانے سے گریز نہیں کرتے۔

دست بیداد زمانہ سے بس اتنی ہے طلب
قتل کر لے مگر انداز نہ چھینے دل کے

(سرابوں کے صدف)

وقت کے ساتھ ساتھ معاشرتی صورتحال میں بھی تبدیلی آتی رہتی ہے۔ بعض دفعہ یہ تبدیلی اس قدر توانا ہوتی ہے کہ پُرانے معاشرے کے بنیادوں کو اُکھاڑ پھینکتی ہے۔ انسان اس دنیا میں مسافر کی حیثیت سے موجود ہے۔ ہجرت اس کے خون میں موجود ہے لیکن تاریخ گواہ ہے کہ تاریخ کی المناک ہجرت تقسیمِ ہندوستان کے وقت عمل میں آئی جب دربدری کے دُکھ کے ساتھ جان، مال، عزت و آبرو کے خوف نے لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لیا کہ جس کے اثرات وقت کے حصار سے بھی مکمل طور ختم نہ ہو سکے۔ خورشید رضوی اس ہجرت کے عینی شاہد ہیں بلکہ وہ خود اُس داستانِ دربدری کے کردار رہے ہیں۔

لے کے آیا ہوں ترے پاس فقط گرد و غبار
رنگ سب چھین لیے دربدری نے دل کے

(سرابوں کے صدف)

ہمارا معاشرہ انحطاط پذیری کا شکار ہو رہا ہے۔ روحانیت جو کہ ہمارے معاشرے کا اہم عُنصر سمجھی جاتی تھی آج مادیت کے دھندلکوں میں کھو چکی ہے۔ مادیت پرستی قوموں کو زوال کی جانب دھکیلتی ہے۔ اشیاء کے مقابلے میں انسان کی قدر و اہمیت میں کمی آتی جاتی ہے۔ خود پسندی کو فروغ ملتا ہے۔ انسان ضرورتوں کے پیچھے اس تیزی سے بھاگتا ہے کے اپنے آپ کو فراموش کر بیٹھتا ہے۔ خورشید کو اس تہذیبی انحطاط کا احساس بھی ہے

اور دُکھ بھی جس کا اظہار وہ اس انداز میں کرتے ہیں:

ہم ہیں اس گھر میں تو اس کو کوئی پوچھتا نہیں
اک جہاں ٹوٹے یہاں سونے کی کانیں ہوں اگر

(سرابوں کے صدف)

خورشید کی غزلیات میں داخلی کیفیات کو انسانی تعمیر میں زیادہ دخل ہے۔ ان کے ہاں خارج کی حیثیت لوازماتِ زیست سے زیادہ نہیں ہے۔ خورشید باطن کو تبدیلی کو مرکز تصور کرتے ہیں۔

لوگ کیا بن جائیں باطن کا کہا مانیں اگر
معجزے ہو جائیں، جی میں معجزے ٹھانیں اگر

(سرابوں کے صدف)

خورشید رضوی کی غزل مشاہدے کی غزل ہے وہ دروں بینی کے ساتھ خارج بین بھی ہیں ان کے ہاں اگر کیفیات کو اہمیت حاصل ہے تو اس جملے کو دیکھنا ہے مجھے مبہم لگ رہا ہے۔ لوگوں اسے بھی ان کا انسلاک کم نہیں ہوتا۔ خورشید انسانیت پسند شاعر ہیں وہ ایسے تخلیق کار ہیں جو معاشرے میں ہو آن چاک و چوبند رہتا ہے۔ بیک وقت ان کی نگاہ علم ادب میں ہونے والی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ سائنس وٹیکنالوجی کی دنیا میں انقلاب برپا کر دینے والی تبدیلیوں پر بھی ہے۔ خورشید رضوی تبدیلی کو قبول کرنے والے شاعر ہیں وہ اس جمود کو توڑنے والے شاعر ہیں جس سے معاشرے کی تعمیر و ترقی میں رکاوٹیں آئیں لیکن اس کے ساتھ بحیثیت انسان نئی راہوں پر پیش آنے والی مشکلات کا خیال بھی ان کے ذہن میں موجود ہے۔

جذبِ زمیں کو چھوڑ کر اُڑ تو چلا ہے آدمی
دیکھیئے اب کہاں جمیں اس کے قدم زمیں کے بعد

(رائگاں)

سائنس نے ہمارے معاشرے کی راہیں مختلف سمتوں میں پھیر دی ہیں۔ چونکہ ہمارا معاشرہ تعلیمی پسماندگی کا شکار ہے اور یہاں اوہام کا عمل دخل زیادہ رہا ہے۔ سائنس نے نتائج سے اس کو توڑا ہے جس کی وجہ سے تعلیم سے منسلک افراد نے بہت جلد اس کو قبول کیا جبکہ اکثریت افراد جن میں قدامت پسند افراد موجود ہیں نے اس کو قبول کرنے میں شد و مد کر رہے ہیں۔

برصغیر پاک و ہند کے معاشرتی حالات ابتداء سے کچھ ایسے سازگار نہیں رہے کہ یہاں خوش حالی و

آسودگی کا دور دورہ رہا ہو۔ البتہ کچھ بادشاہوں کے ادوار ایسے گزرے ہیں جہاں عوام نے کچھ سکھ کا سانس لیا وگرنہ مکمل معاشرہ غم کے گہرے بادلوں میں ہمیشہ سے لپٹا رہا ہے اور جب اجتماعی طور پر معاشرہ اس کا شکار ہوتا ہے تو غم ہمیشہ کے لیے لاشعور میں سرایت کر جاتا ہے اور ہر ایسا واقعہ جو المناک کیفیات سے دوچار ہو اس میں خود کی تصویر نظر آتی ہے۔ غم کسی نہ کسی انداز میں انسان میں ٹھہراؤ پیدا کرتا ہے۔ اُردو غزل کی روایت میں معاشرے کے اس رنج والم بیان کیا گیا ہے اسی لیے خورشید رضوی کے ہاں بھی ہمیں اس کا اظہار ملتا ہے۔

مدھم ہے نوا میری کسی اور سبب سے
یہ بات نہیں ہے کہ غمِ تازہ نہیں ہے

(رائگاں)

خورشید کے دردِ دل کا اظہار موجود ہے لیکن یہ اظہار ان کی غزل کو داخل کا نوحہ نہیں بناتا بلکہ ان حقائق سے جوڑتا ہے جن کا اظہار از حد ضروری ہے وہ آزادی اظہار کے مباحث کے لئے ڈاکٹر ارشد معراج کا مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو افسانے میں آزادی اظہار کے مسائل کا لازمی مطالعہ کریں۔ کو معاشرے کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں ایسے ادوار گزرے ہیں جب ادباء کے اظہار خیالات پر قدغنیں لگانے کے ساتھ انہیں پابند سلاسل بھی کیا جاتا تھا۔ جرنیلی دور کا دور ایسے سیاہ واقعات سے بھرے پڑے ہیں۔

زمانہ لب پہ یہ انگشت رکھ کے کہتا ہے
کہ دردِ دل نہ کہو اور کہو تو ڈرتے ہوئے

(امکان)

انسان کی ترقی کا راز، اس کے مسائل کا حل آگہی میں مضمر ہے، جیسے جیسے انسان ارتقاء اور ایجادات کے زینے کو عبور کیا ہے ویسے ویسے مسائل نے اسے اپنی گرفت میں لے کر آگے بڑھنے سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ خورشید اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں ان کے ہاں اُس گمشدگی کا اظہار شدت سے ملتا ہے جس میں انسان اپنی ذات کے نہاں خانے میں مقید ہوتا ہے۔

ہاں وُہی دشت وہی گمشدگی اچھے تھی
اب کے بھٹکوں تو مجھے راہ پہ لائے نہ کوئی

(امکان)

خورشید کی غزلوں میں نا معلوم سے معلوم کا سفر موجود ہے۔ وہ انسان کی عدم استفہامی کیفیات کو جانتے ہیں۔ کیونکہ جب تک منزل کا تعین نہ ہو اس وقت تک کا سفر دھند کا سفر ہے۔

وقت ہجرت کا ہے ہجرت کی زمیں نا معلوم
کس مکاں کا ہو دلِ زار مکیں نا معلوم

(امکان)

خورشید کی شاعری میں تہذیبی وراثت کے کھو جانے کا دُکھ موجود ہے انہیں اس بات کا اندازہ ہے کہ ہماری تہذیبی اقدار کو سنبھالنے والے افراد کا رُخ کسی اور سمت ہے۔

کس کو دوں اپنی طبیعت کی وراثت خورشیدؔ
اک امانت ہے مرے پاس امیں نا معلوم

(امکان)

ماضی کی لمبی مسافت طے کر کے لائی جانے والی تہذیب کا کچھ عرصے میں تہذیبی یلغار سے معدوم ہونے کا اندیشہ نہایت دلخراش ہے۔

ماضی کو بھی دیکھیں گے اب اپنی ہی نظر سے
اس کی بھی خبر کُچھ نہ ملی ، اہلِ خبر سے

کُچھ گم ہوئے اوراق روایت میں نہ آ کر
کُچھ مسخ ہوئے حُسنِ روایت کے اثر سے

(امکان)

بعض اوقات خواہش انسان کو ان چیزوں سے بھی بیزار کر دیتی ہے جو فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق ہوتی ہیں۔

فرسودگیِ رنگِ گلستاں سے ہوں بیزار
اُکتایا ہوا برگ و بر و شاخ و ثمر سے

گردش میں ہیں سب دشت و دیار و در و دیوار
وہ بھی ہیں سفر میں کہ جو نکلے نہیں گھر سے

(امکان)

خورشید کی غزل میں اجتماعی رویوں کی عکاسی مکمل مشاہدے کے ساتھ موجود ہے۔ انسان کی زندگی میں نشیب و فراز آتے رہتے ہیں اور ہر آن میں وقت گزرتا رہتا ہے کبھی رکتا نہیں لیکن اس سے اچھے وقت کے ساتھیوں کے اصلی چہرے سامنے آجاتے ہیں۔ ہمارے معاشرے کی ایک حقیقت ہے کہ جب کسی انسان کے پاس آسائشوں کے انبار ہوں گے تو اس وقت اس کے پاس کئی افراد بھی موجود ہوں گے اور جب وہی شخص حالات کی ستم ظریفی کا نشانہ بنتا ہے تو وہی لوگ کنارہ کشی اختیار کرنا شروع کر دیتے ہیں اور جن پر امید ہوتی ہے بسا اوقات وہی سب سے پہلے ساتھ چھوڑتے ہیں یہ ایسا ثقافتی دُکھ ہے جو معاشرے میں ناسور کی طرح رس رہا ہے۔

نہ تھا تیرگی میں کوئی ہم سفر
فقط ہم گئے یا ستارے گئے

بسا اوقات منزل کے نشان انتہائی قریب ہوتے ہیں لیکن اس تک پہنچنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ خورشید کے ہاں اس کا اظہار مخصوص انداز میں موجود ہے۔

ذرا دور پر روشنی بھی رہی
مگر ہم اندھیرے میں مارے گئے

(امکان)

ترقی یافتہ معاشروں میں تہذیبی اقدار میں خوشنما تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں افراد میں اجتماعیت کو فروغ دیتی ہیں۔ وسعتِ فکر و نظر انسان کے لیے اجتماعی طور پر اہمیت کی حامل ہے وسعتِ فکری انسان کو جمودی معاشرے سے دور لے جاتی ہے لیکن جہاں سوچ پر بھی پابندیاں موجود ہوں وہاں شوریدگی میں اضافہ ہوتا ہے جس کے نتیجے میں بغاوتیں جنم لیتی ہیں اور بغاوت ہمیشہ روایت سے انحراف کی جانب پہلا قدم گردانی جاتا ہے۔

شاید اسی لیے ہے شوریدگی زیادہ
آنے لگا سمندر گھُٹ گھُٹ کے ندیوں میں

رفتارِ آسماں میں کوئی کجی نہیں ہے
ساری کجی نہاں ہے آنکھوں کے زاویوں میں

اے اشکِ غم بپھر کر یہ بام و در ہلا دے
کب تک پڑا رہے گا دُکھتے ہوئے دلوں میں

(امکان)

معاشرہ ہمیشہ اجتماعیت کے سائے میں آگے بڑھتا ہے جہاں انفرادی سوچ کا جنم اجتماعی سوچ پر غالب آجائے وہاں انتشار، بے سکونی، غیر یقینی، الزام تراشی جیسی خرافات جنم لیتی ہیں جو امن وسکون کے لیے زہر قاتل ہیں۔ خورشید رضوی کی غزل میں معاشرے میں موجود خود پسندی کے رویے پر دکھ کا اظہار موجود ہے۔ وہ باہمی رابطے پر یقین رکھنے والے انسان ہیں۔ ان کے ہاں معاشرے کے ربط میں ہی تہذیب کی بقا کا راز مضمر ہے۔

لب سے دل کا دل سے لب کا رابطہ کوئی نہیں
حسرتیں ہی حسرتیں ہیں مدعا کوئی نہیں

سب کے سب اپنے گریبانوں میں ہیں ڈوبے ہوئے
گُل سے گُل تک رشتۂ موجِ صبا کوئی نہیں

اپنے من کا عکس ہے اپنی صدا کی باز گشت
دوست، دشمن، آشنا، نا آشنا کوئی نہیں

حالِ زار ایسا کے دیکھے سے ترس آنے لگے
سنگدل اتنے کہ ہونٹوں پر دعا کوئی نہیں

(شاخِ تنہا)

خورشید اس حالتِ زار پر افسردہ ہیں۔

ہجومِ اشکِ تپاں آنکھ میں رُکا ہوا ہے
ہمارا حال نہ پوچھو کہ دل دُکھا ہوا ہے

(دیریاب)

خورشید رضوی کی غزل میں اسلاف کی فکری روایت سے دوری کا افسوس موجود ہے۔ ہماری تہذیبی

تاریخ ایسی نابغہ روزگار اشخاص سے بھری پڑی ہے جنہوں نے وقت کے دھارے کو موڑا اور تقدیر کے ماتھے پر اپنی نشانی ثبت کی ۔لیکن ہم میں وہ ولولہ موجود نہیں ہے ہم اس روایت کے راگ الاپتے ہیں اس کے جانے کا ماتم کرتے ہیں لیکن عمل کے لیے آگے نہیں بڑھتے ۔لیکن خورشید کے ہاں اس روایت کو صرف سینے سے لگائے رکھنا اور ٹسوے بہانا کافی نہیں بلکہ ان کے ہاں عملاً اس روایت کو آگے لے کر چلنے کا رجحان موجود ہے ۔ان کی شاعری میں سماج کے ہر فرد کی نمائندگی ملتی ہے ۔انہوں نے معاشرے کو مختلف زاویوں سے دیکھا اور اس میں موجود خرافات کا منظوم نوحہ لکھا ہے ۔

کیا کوئی راکب نہیں ہم میں سمندِ وقت کا
نقشِ پا سب ہیں تو کیا زنجیرِ پا کوئی نہیں

کارواں خورشیدؔ جانے کس گُپھا میں کھو گیا
روشنی کیسی ، کہ صحرا میں صدا کوئی نہیں

کون پہچانا کسی کو چار دن زیرِ فلک
لوگ آئے اور اپنے آپ میں مہماں رہے

عہدِ رفتہ کے ولولوں کا نشاں
اک مسلسل سی بے کلی ہے فقط

(شاخِ تنہا)

خورشید اپنی آگاہی میں بیک وقت مصروف عمل نظر آتے ہیں خارج کے مشاہدے سے ان کے ہاں تلاشِ خودی کا عمل رواں دواں رہتا ہے ۔

سُنا ہے سانپ کے من میں ہے سانپ کا تریاق
اگر ہے یوں تو سہیں نیشِ آگہی کچھ اور

(شاخِ تنہا)

خورشید کی غزل میں معاشرے میں موجود اخلاقی گراوٹ کا اظہار موجود ہے وہ تبدیلی کے عمل کو اجتماعی انداز میں ہونے پر زور دیتے ہیں کیونکہ ایک فرد کبھی بھی مکمل انداز میں تبدیلی نہیں لا سکتا اکیلے میں اس کی تگ و

دونا کام رہے گی اور وہ زمانے کی برائیوں کا حصہ بن جائے گا۔

مرے عزیز وطن کی فضا نے بھر دی ہے
مری سرشت کے اندر منافقت کیا کیا

(شاخِ تنہا)

ادب اپنا وجود گردوپیش کے حالات سے ہی تخلیق کرتا ہے چاہے نظم ہو یا نثر کسی نہ کسی حد تک اس میں معاشرے کی کارفرمائی ضرور ہوتی ہے۔ خورشید رضوی کی غزل بھی معاشرے کی عکاس ہے۔ خورشید اپنی فنی و معنوی حیثیت برقرار رکھتے ہوئے معاشرتی حقائق رقم کرتے چلے جاتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں مختلف افکار کے افراد موجود ہیں ایک گروہ کی سوچ میں تبدیلی کو قبول کرنے کی ہمت موجود ہے جبکہ اسی معاشرے میں ایسے افراد بھی موجود ہیں جن کے ہاں تغیر پذیری کا وجود جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایسا ممکن نہیں کہ کسی ایک سوچ کی حمایت میں دوسرے لوگوں کو معاشرے سے تلف کر دیا جائے بلکہ ایک مخصوص عمل کے ذریعے موخرالذکر لوگوں کو ساتھ ملانا پڑے گا اور اس میں ٹھہراؤ بہت ضروری ہے اس عمل کو 'برداشت' کا عمل کہتے ہیں جو معاشرے کو تصادم سے محفوظ رکھتا ہے۔ خورشید رضوی اس عمل کو واضح انداز میں بیان کرتے ہیں

دل کے غم کو دل میں دبا لو
یہ انگارہ یہیں بجھا لو

پلکوں پر تھراتے قطرو
میں تم کو تم مجھے سنبھالو

(دیریاب)

خورشید کے ہاں تغیر و تبدل کا اعلان موجود ہے۔

آندھی آنے ہی والی ہے
تنے ہوئے مکڑی کے جالو

(دیریاب)

خورشید باعمل و اصول پسندی کے قائل ہیں، خورشید کی غزلوں میں ایسی روایتی عمارتوں کے انہدام کی حمایت موجود ہے جن کی افادیت وقت نے زائل کر دی ہو۔ اس عمل میں وہ سب سے پہلے خود پیش ہوتے ہیں بعد میں دوسروں کو آنے کی دعوت دیتے نظر آتے ہیں

مری نظر میں یہ دیوار و در نہیں ہیں درست
سو میں گرا کے مکاں پھر بنانا چاہتا ہوں

وہ جن میں ہوں نئے امکاں نئے نئے شب و روز
میں اپنے وہم و گماں پھر بنانا چاہتا ہوں

بہت دنوں سے اسے سُن کے جاگتے نہیں دل
حرم کی طرزِ اذاں پھر بنانا چاہتا ہوں

(دیریاب)

خورشید رضوی کے ہاں ہمیں مثبت چیزوں کو قبول کرنے کا رجحان موجود ہے جو کہ ایک تعلیم یافتہ و ترقی پسند شخص کی نشانی ہے جو اپنے معاشرے کو زمانے کی رفتار کے ساتھ چلتا دیکھنا چاہتا ہے۔ خورشید اس مقام پر اقبال کی تتبع کرتے نظر آتے ہیں لیکن اپنے انداز اور لہجے کی انفرادیت کو برقرار رکھے ہوئے ہیں مثلاً:

آنکھ کو وسعتِ صحرا کا تماشائی کر
نگہِ مُردہ و افسردہ کو روزن سے نکال

کر کُچھ ایسا کہ تری خاک میں پرواز آئے
اب کوئی اسپِ فلک سیر، اسی توسن سے نکال

قربِ منزل کی بشارت ہے بہت دور کی بات
راہبر، پہلے ہمیں پنجہِ رہزن سے نکال

(دیریاب)

ہمیں معاشرتی ربط کو قائم رکھتے ہوئے تہذیبی روایات کو ری بلڈ کرنے کی ضرورت ہے تا کہ اس ترقی یافتہ دور میں وقت کی رفتار کو پہچان کر اپنی موجودگی کا احساس پوری دنیا کو دلائیں کیوں کہ عدم موجودگی کا مطلب ہے اپنے حاصل شدہ مقام کو رضامندی سے کسی اور کے سپرد کر دینا اور یہ تبھی ممکن ہو سکے گا جب نظارہ صحرا روزن سے نہیں صحرا میں جا کر کیا جائے۔ کیوں کہ وسعت کا اندازہ ہونے کے بعد ہی اسے عبور کرنے کے اقدامات

کیے جاسکیں گے۔

خورشید زندگی اور مسائلِ زندگی کو سمجھنے اور سمجھانے کے قائل ہیں اور اس معاملے میں ان کا انداز استادانہ ہے وہ ایسی عام فہم مثال میں سے زندگی کی مثال دیتے ہیں کہ جو ایک عام قاری بھی سمجھ سکے۔ جس طرح استاد کسی مشکل چیز کو سمجھانے کے لئے ایسی آسان مثال دیتا ہے جو کلاس میں موجود سطحی ذہن رکھنے والے طالب علموں تک بھی با آسانی پہنچ سکے۔

یہ زندگی ہے کسی کے مکاں کا سناٹا
ہم انتظار میں ہیں اور وہ گیا ہوا ہے

(دیریاب)

خورشید معاشرتی ناہمواریوں کو بیان کرتے ہوئے ایسا لفظی خاکہ بناتے ہیں جس سے قاری کے تخیل میں مختلف خوش نما اور خوش رنگ پینٹنگز اُبھرتی ہیں جو تفہیم شاعر کے ساتھ تفہیم تہذیب بھی ہے۔

سرِ بریدہ کی صورت ہوا سے گر ہی نہ جائے
گلاب شاخ پہ پھوٹا نہیں ، رکھا ہوا ہے

ہجوم ٹوٹتا جاتا بکھرتا جاتا ہے
کہ دل کٹے ہوئے ہیں راستہ بٹا ہوا ہے

(دیریاب)

پاکستانی معاشرہ مختلف نظاموں میں منقسم معاشرہ ہے جس کا بخوبی اندازہ افراد کے مزاج ، تخیل ، عادات ، رویوں سے لگایا جاسکتا ہے۔ جاگیردارانہ نظام ہمارے معاشرے میں ایک عفریت کی طرح موجود ہے اس کی جڑیں بہت مظبوط ہیں۔ جس سے چھٹکارا پانا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ مغربی معاشرے نے انقلابی تبدیلیوں کے باعث اشتراکی نظام تک رسائی حاصل کی ہے۔ ہمارے معاشرے نے تبدیلی کو اس سُرعت سے قبول نہیں کیا۔ نظام ہی معاشرے میں موجود افراد کی فکریات کے عکاس ہوتے ہیں۔

خورشید کے ہاں تمدنی ہم آہنگی موجود ہے دوسروں کے ایسے کارناموں کو قبول کرنے کا حوصلہ موجود ہے جس میں من جملہ انسانوں ے لیے پیغامِ مسرت ہو۔ خورشید رضوی کی غزل میں تنوع موجود ہے وہ تنوع تخیلاتی بھی ہے اور موضوعاتی بھی۔ غزل کی تنگ دامنی کا رونا اب بے وقت کی راگنی کے سوا کچھ نہیں آل احمد سرور کہتے ہیں:

''آج کا دور کسی منظم فسلفے ، کسی مرتب فکر کے ریاض کی بجائے فوری کیفیات کے بیان کو ترجیح دیتا ہے کیونکہ یہ شعور کی رو کا زیادہ خوگر ہو گیا ہے۔ یہ اپنی جگہ درست ہے مگر صراحت ، وضاحت ربط و تسلسل کی اہمیت اپنی جگہ ہے ۔ اسی لیے غزل اپنے طور پر زندگی کی واردات اور کیفیات پیش کرتی رہے گی ۔اس کی زبان میں خاموش تبدیلی ہوتی رہے گی مگر اس کی ایمائی صلاحیت اور دروں بینی کی خصوصیت باقی رہے گی''۔۲

مندرجہ بالا اقتباس سے ربط و تسلسل کی اہمیت واضح ہوتی ہے جو کہ غزل کے لیے ناگزیر ہے۔خورشید رضوی کی غزل میں لفظیات کا انتخاب اہمیت کا حامل ہے اور الفاظ کا ربط ہمیشہ شاعر کے تخیل کے تسلسل تک رسائی میں مدد فراہم کرتا ہے ۔خورشید رضوی اس پر قدرت رکھتے ہیں جس کی بنیادی وجہ کلاسیکی شعری روایت سے ان کا گہرا لگاؤ ہے ۔اس ضمن میں امجد طفیل کہتے ہیں :

''غزل گو شاعر کے بارے میں یہ بات یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کی انفرادیت غزل کی روایت کے پسِ منظر میں نمایاں ہوتی ہے ۔خورشید رضوی انہی معنوں میں ایک منفرد شاعر ہیں کہ ان کی شاعری ہمیں اردو غزل کے روایت کے پسِ منظر میں اپنی شناخت بناتی دکھائی دیتی ہیں ۔ خورشید رضوی نے شاعری کرنے سے پہلے اس شعری روایت کو اپنے اندر جذب کیا ہے جس کا وہ تسلسل ہیں''۔ ۳

امجد طفیل کی بات کی تصدیق خورشید رضوی کے ان اشعار سے ہوتی ہے

کرو جو یاد تو ہم سے بھی نسبتیں ہیں تمہیں
وہ نسبتیں جو کفِ پا کو نقشِ پا سے ہیں

ذرا میں زخم لگائے ذرا میں دے مرہم
بڑے عجیب روابط مرے صبا سے ہیں

ترے بغیر بھی کٹتی رہی ذرا نہ رکی
شکایتیں مجھے عمرِ گریز پا سے ہیں

(شاخِ تنہا)

کب نکلتا ہے کوئی دل میں اُتر جانے کے بعد
اس گلی کی دوسری جانب کوئی رستہ نہیں

تم سمجھتے ہو بچھڑ جانے سے مٹ جاتا ہے عشق
تم کو اس دریا کی گہرائی کا اندازہ کوئی نہیں

(شاخِ تنہا)

بھرے جہاں میں بھی مٹتی کہاں ہے تنہائی
حصارِ ذات مرے ساتھ ساتھ چلتا ہے

(شاخِ تنہا)

میں سوچتا تھا کہ وہ زخم بھر گیا کہ نہیں
کھلا دریچہ در آئی صبا کہا کہ نہیں

ہوا کا رُخ تو اسی بام و در کی جانب ہے
پہنچ رہی ہے وہاں تک مری صدا کہ نہیں

زباں پہ کچھ نہ سہی سن کہ میرا حالِ تباہ
ترے ضمیر میں اُبھری کوئی دعا کہ نہیں

لبوں پہ آج سرِ بزم آ گئی تھی بات
مگر وہ تیری نگاہوں کی التجا کہ ''نہیں''

(شاخِ تنہا)

خورشید کی شاعری میں ہمیں ان کے نقشِ اول ''شاخِ تنہا'' میں روایت سے مخصوص وابستگی کے نمایاں

آثار ملتے ہیں۔ ان کی غزل کے آغاز، الفاظ کا انتخاب، ان کا برتاؤ اور تخیل کا استخراج سب میں ایک تسلسل موجود ہے۔ خورشید کی غزل جدیدیت و کلاسیکیت کا حسین سنگم ہے۔

نظر کے سامنے اُٹھیں گے روزِ حشر مگر
وہ دل میں دفن رہے گا جو خواب دل میں ہے

(شاخِ تنہا)

گلستاں میں زخمِ الفت سے کوئی خالی نہ تھا
خوشبوؤں کے تیر تھے بادِ صبا کا سینہ تھا

مجھ کو اپنی ذات کے ٹکڑے نظر آتے رہے
انجمن میں جو بھی تھا ٹوٹا ہوا آئینہ تھا

اب تو اک مدت سے اس کی دید بھی باقی نہیں
وہ حسیں منظر کہ جس کا دیکھنا کافی نہ تھا

صحبتِ نا جنس میں لے کر پھریں جنسِ گراں
اہلِ دل کا روزِ اول سے یہی روزینہ تھا

(شاخِ تنہا)

خورشید رضوی کا اندازِ مشاہدہ انہیں اپنے ہم عصروں جداگانہ بناتا ہے۔ خورشید کے ہاں محبت کا بیان تہذیب کے پردوں میں موجود ہے وہ محبت کو تحقیر کے پاتال سے تقدیس کی بلندی پر لے جاتے ہیں ان کے ہاں محبوب کا خیال ایسے ہے جیسے کڑی دھوپ میں سایے کی تلاش کے لیے بھٹکنے والے کو سایہ میسر آجائے۔

غمِ ایام سے تھک کر ترا دھیان آیا ہے
کیا کڑی دھوپ ہے اور کتنا گھنا سایہ ہے

(دیریاب)

دل میں یوں اُترا کسی کی ساعدِ سیمیں کا دھیان
شاخِ گُل جس طرح دیوارِ قفس سے آ لگے

کھل رہی ہے گوشہ گوشہ مجھ پہ چشمِ التفات
وہ یہیں پتھر کا ہو جائے تو کیا اچھا لگے

(شاخِ تنہا)

کیا کیا نہیں رہا میں فضاؤں سے شرمسار
جب چاندنی شباب پہ آئی ترے بغیر

(شاخِ تنہا)

خورشید کی غزل میں خارجی عناصر کو یکسر نظر انداز نہیں کیا گیا۔ بلکہ ان کے نزدیک وہ ''بڑی چیز'' ہیں۔

کنجِ لب و رخسار و دہن بھی ہیں بڑی چیز
ظاہر کے مظاہر کی پھبن بھی ہے بڑی چیز

ہر سانس ترے قُرب کی لذت سے ہے سرشار
اب روح نے مانا کہ بدن بھی ہے بڑی چیز

کچھ گُل پہ ہی موقوف نہیں سحرِ بہاراں
یہ مہکی ہوئی خاکِ چمن بھی ہے بڑی چیز

معاشرے میں نفسانفسی کی بدولت اخلاص و رواداری جیسی تہذیبی اقدار ہمارے درمیان سے اُٹھتی جا رہی ہیں خورشید اس بات کو طنزیہ انداز میں یوں بیان کرتے ہیں۔

اخلاص ترے دل میں نہیں بھی ہے تو کیا ہے
ملنے کا یہ بے ساختہ پن بھی ہے بڑی چیز

(سرابوں کے صدف)

خورشید کے ہاں مایوسی کے آثار نہیں ہیں وہ امید کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

گلشنِ دہر میں کچھ بوئے وفا باقی ہے
کہ خزاں میں بھی صبا سوئے چمن آتی رہی

ہم کبھی چاک گریباں تھے کبھی خاک بسر
کر گزرتے رہے جو عشق میں بن آتی رہی

(رائگاں)

خورشید رضوی فن کی ضرورت و اہمیت سے آگاہ ہیں ان کے نزدیک فن ہی رابطوں میں تسلسل کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ خورشید سیاسی سماجی عوامل کے ذریعے ہونے والی تبدیلیوں سے آگاہ ہیں اور وہ اس کے مثبت اثرات کو فن کے ذریعے مزید نکھارنے اور غیر مثبت تبدیلیوں کو مثبت بنانے پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک فنا اگر حقیقی طور فن ہے تو سامنے سنگ بھی ہوں گے تو فن اپنا اثر دکھائے گا۔

ترے بھی دل پہ اثر کر گیا سُخن کر گیا آخر
ہزار سنگ مقابل ہو فن ہے فن آخر

(دیریاب)

خورشید رضوی معاشرے میں امن و سکون لیے باہمی قُربت پر یقین رکھتے ہیں جو کہ آج کل کے معاشرے میں مفقود ہو چکی ہے۔ خورشید افراد میں موجود فاصلوں کی وجہ باہمی رابطوں میں فقدان کے ذریعے پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کو بتاتے ہیں ان کے نزدیک غلط فہمی ویسے ہی بدنما داغ ہے جیسے چمکتے چاند کو گہن لگ جاتا ہے، اور غلط فہمیوں کا حل اسی صورت میں ممکن ہے جب فریقین میں سے کوئی ایک دوسرے کے پاس جا کر اس کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

کبھی ملو تو کدورت بھی چھٹ ہی جائے گی
کہ دائمی تو نہیں چاند کا گہن آخر

بہار میں ترا تا دیر انتظار کیا
بکھر گئے غم میں گل و سمن آخر

کہیں بھی جائیں پلٹ کر یہیں پہ آنا ہے
سنبھالتی ہے ہمیں تیری انجمن آخر

(دیریاب)

افسوس مرا چراغِ منزل
مستور ہے گردِ رہ گزر میں

(رائگاں)

پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی اس نظریے سے منسلک افراد کے دل میں یہ خیال راسخ ہو چکا تھا کہ جس مقصد کے تحت بعداز جدو جہد یہ ملک حاصل کیا گیا ہے عین اسی طرح معاشرے کا آزادانہ قیام عمل میں لایا جائے گا اور ایک مثالی ریاست کے طور پر دنیا کے نقشے پر اُبھرے گا۔ لاکھوں جانوں کے نذرانے کے بعد افراد نے آزادی کا خیر مقدم بہت جوش اور ولولے سے کیا اس ولولے کے پیچھے وہ تہذیبی یکسانیت تھی جو افراد کو پاکستان کھینچ لائی۔ کہیں نہ کہیں یہ بات اذہان میں موجود تھی کہ انگریزوں کے معیاراتِ زندگی سے کسی طور چھٹکارا ملے گا۔ معیاراتِ معاشرہ اپنے انداز سے متعین کیے جائیں گے۔ لیکن بدقسمتی سے ابتدا سے ہی نا مساعد حالات نے ارضِ وطن کو اپنی لپیٹ میں لیا جو مکمل انداز سے ابھی تک اس سے نکل نہیں پایا۔ نہ تو معاشی سسٹم درست ہوا، نہ امیر و غریب میں فاصلہ کم ہوا، نہ تعلیمی میدان میں تبدیلیوں کے خواب پورے ہوئے، نہ عدل و انصاف کے تقاضوں کے تحت سوچ بچار کا عمل مکمل ہوا۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا آزادی و جمہوریت کے نظام کو ہی اغوا کر لیا گیا اور وہ کسمپرسی کی حالت کو چھوڑنے کی خاطر لاشوں کے دریا عبور کر کے یہاں آئے تھے وہ جوں کی توں برقرار رہی۔ کُرسی صدارت کے بیٹھنے والے بدلتے رہے باقی نہ معاشرے میں کوئی خاطر خواہ تبدیلی آئی اور نہ ہی نظام میں۔ ایسے میں اہلِ قلم نے قلم کا حق ادا کیا ور عوامی سطح پر اپنا پیغام پہنچاتے رہے۔ گو کہ اس دوراں انہیں بہت سی سختیوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن انہوں نے کسی کو بھی خاطر میں نہیں لایا اور بھرپو انداز میں عوامی آگاہی کا عمل جاری رکھا۔ خورشید بھی اس سارے ماحول کا حصہ رہے لہذا اس کا اظہار ان کے ہاں پوری شدو مد سے ملتا ہے۔

جو میرے دل میں ہے خورشیدؔ مجھ کو لکھنا ہے
بلا سے آئے تہہِ خنجر جفا میرا ہاتھ

(رائگاں)

انگشت اگر قلم نہ ہو گی
خونابی دل رقم نہ ہو گی

رونا ہے تو آج کھل کے رو لو
کل تک یہ فضائے غم نہ ہو گی

پروانوں کی جانثاریوں سے
تنہائی شمع کم نہ ہو گی

سوچا ہے کہ آج ہم نہ ہوں گے
یا کاہشِ دمبدم نہ ہو گی

(دیریاب)

خورشید معاشرے کی زبوں حالی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایسے افراد بھی اپنے عقل پر نازاں ہوں گے جو افراد کے لیے کوئی قابلِ قدر کارنامہ تو سرانجام نہ دے سکے البتہ طریقہ ہائے ظلم وستم میں نئی ایجادوں پر نازاں ہیں

وہ بھی ہیں بہت عقل پہ نازاں کہ جنہوں نے
خلقت پہ نئے ظلم کے انداز نکالے

(امکان)

خورشید ہردم تہذیب وثقافت کی ترویج میں سرگرم رہنے والے شاعر ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ آج کے اس تیز دور میں مغربی تہذیب کے ہرآن حملوں سے واقف ہیں۔خورشید نا صرف اس سے واقف ہیں بلکہ وہ اس کے نتیجے میں آنے والے خونریز نتائج سے بھی واقف ہیں،خورشید ایسے واقعات سے نہ صرف نئی نسل کو آگاہ رکھتے ہیں بلکہ انہیں یہ بھی یاد دلاتے ہیں کہ یہ کوئی نئی یلغار نہیں ہے بلکہ نئے لبادے میں پرانی چیز ہی ہے۔وہ اس مغربی ''ہوا'' سے مشرقی گلشن اوراس کے محافظوں کوخبردار کرتے ہوئے کہتے ہیں

وہی موسم ہے ، وہی گل ، وہی خوں ریز ہوا
مار ہی ڈالے نہ ہم کو یہ جنوں خیز ہوا

دل آشفتہ ، شجر ہیں ، نہ فصیلیں ، نہ پہاڑ
کچھ نہیں راہ میں آتی ہے بہت تیز ہوا

دن کو کرتی ہے کڑی دھوپ چمن کو پامال
شب کو آتی ہے اُڑاتی ہوئی شب دیز ہوا

کہیں منظر نہ بدل جائے یکا یک خورشیدؔ
کہیں آندھی میں نہ ڈھل جائے دل آویز ہوا

(امکان)

یہ اصول ہمیشہ سے رہا ہے کہ کمزور ہی ہمیشہ مشکل کا سامنا کرتا ہے چاہے کمزور ہو یا شاہے کمزور قوم کیوں کہ کمزور وہی ہو جو اپنے محور سے دور ہوگا۔ ہمارا حال بھی بالکل ایسے ہی ہے ہم تہذیبی وثقافتی طور پر اپنے محور سے بہت دور جا چکے ہیں ہم مختلف گروہوں میں بٹ چکے ہیں۔ جس کی وجہ سے مختلف تہذیبی یلغاروں کی زد میں رہتے ہیں۔ خورشید کہتے ہیں کہ ہمیں اس مصیبت کا علاج خود ہی کرنا ہوگا اور کوئی بھی اس میں ہماری مدد نہیں کرسکتا۔

ہم کھوئے ہوئے لوگوں کو ڈھونڈے گا بھلا کون
اب اپنی خبر خود ہمیں لانی ہی پڑے گی

(امکان)

خورشید کی غزل میں شعری تلازمے پوری آب وتاب کے ساتھ موجود ہیں وہ ان کا استعمال بھی بخوبی کرتے ہیں خورشید کی شاعری میں تشبیہ، استعارہ جہاں حُسنِ شعر میں اضافہ کرنے کے لیے ہے وہیں مقصدِ شعر کو پورا کرنے کے لیے بھی ہے۔ ڈاکٹر پروفیسر ہارون الرشید تبسم کہتے ہیں:

> ''ڈاکٹر خورشید رضوی کی غزل میں تشبیہ، استعارے، تراکیب، تلمیحات کا استعمال نہایت سلیقے سے ملتا ہے وہ شعروں کو موتیوں کی طرح غزل کے دامن پر اس طرح جڑتے ہیں کہ وہ چمکنے لگتے ہیں۔ اور ان کی چمک آنکھوں کو خیرہ کرنے لگتی ہے۔ خورشید رضوی ادب کے سمندر میں غواصی کرتے ہوئے بہت گہرائی تک چلے جاتے ہیں اور ان کے ہاتھ بہت کم یاب جواہر ریزے لگتے ہیں اور جواہر ریزے پا کر وہ اکیلے ہی خوش نہیں ہوتے بلکہ وہ دوسروں کو بھی اس خوشی ومسرت میں شامل کر لیتے ہیں۔ ان کی خوشی انفرادیت کے دائرے سے نکل کر اجتماعیت کے دائرے میں شامل ہو جاتی ہے''۔ [۴]

خورشید رضوی کے ہاں ویسے تو بہت سے داخلی و خارجی عناصر کو استعارے کے طور پر استعمال کر کے سماجی مسائل کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ لیکن 'دل' کو بطور خاص استعمال کرتے ہوئے معاشرے کی عکاسی کی ہے۔

چار سمت استادہ تن کی چار دیواری
اور اس کے بیچوں بیچ ڈولتا مکاں دل کا

اپنی رزم گہ میں دل آپ مردِ میداں ہے
اور کون اُٹھاتا ہے قرعۂ گراں دل کا

دل سے حرفِ حق اکثر پھوٹتا تو ہے لیکن
زور توڑ دیتی ہے لغزشِ زباں دل کا

(سرابوں کے صدف)

وہ اپنے ذریعہ اظہار کے لیے خوبصورت الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں۔ ان کے لہجے میں چاشنی اور مٹھاس موجود ہے۔ وہ معاشرتی، سماجی مسائل اور ناہمواریوں کی کڑواہٹ کو بھی نہایت خوبصورتی کے سات سپرد قرطاس کرتے ہیں۔

ہوا نہ تیری مہک سے کبھی جدا مرا ہاتھ
چمن چمن میرا دامن صبا صبا مرا ہاتھ

یہ فیض بھی تو انہی ظلمتوں سے پایا ہے
کبھی کبھی مہِ کامل کو جا لگا مرا ہاتھ

زمیں کے تھامنے والے کرم ہے یہ بھی ترا
دُعا کو ہاتھ اُٹھایا تو اُٹھ گیا مرا ہاتھ

(رائگاں)

جب پاؤں صبا بہرِ تگ و تاز نکالے
یہ شرط ہے اس پر کہ نہ آواز نکالے

تو آ تو سہی صحنِ گلستاں میں بہر گام
استادہ ہیں سب سرو سمن ساز نکالے

آ پہنچا ہے وہ وقت کہ خورشید سرِ بزم
جو دل میں چھپا رکھا ہے وہ راز نکالے

(امکان)

پھر آج اپنے گریباں میں غوطہ زن ہولیں
پڑی ہیں جو تہہ دل میں وہ سیپیاں کھولیں

وہ ایک پل ، وہ ترے لب سے ایک میٹھا بول
پھر آج تلخیٔ ایام میں اسے گھولیں

میں اُس مکاں میں ہوں جس میں پکاریے تو کہیں
کوئی جواب نہ دے اور بام و در بولیں

تو اُن کی چشم و نگاہ پر تو کان دھر کے دیکھ
جو اپنی کشتِ زباں میں خموشیاں بولیں

(شاخِ تنہا)

خورشید کے ہاں بہتر سے بہتر کی تلاش موجود ہے لیکن انسان کی بشری حدود و قیود کو بھی مدِ نظر رکھتے ہیں۔ وہ کسی پڑاؤ کو منزل نہیں سمجھتے بلکہ ''جہاں اور بھی ہیں'' کا خیال ہمیشہ اُن کے ذہن میں تروتازہ رہتا ہے۔

وہ مجھے خاک سے باہر نہیں جانے دیتے
دستِ ساحل سے سمندر نہیں جانے دیتے

ہیں میری راہ کا پتھر مری آنکھوں کا حجاب
زخم باہر کے جو اندر نہیں جانے دیتے

حدِ افلاک پہ جا کر تو صدا دے آیا
مگر افلاک سے اوپر نہیں جانے دیتے

(امکان)

خورشید کی شاعری میں ایسے افراد کے جانے کا دُکھ موجود ہے جو سراپا تہذیب تھے۔ جن کے ساتھ ہونے سے روح تک نہال ہوتی تھی۔ جن کا بولنا، اُٹھنا، بیٹھنا سب کچھ اقدار کی ترویج تھا۔

ان عظیم افراد کا اس جہانِ فانی سے چلے جانا کسی عظیم صدمے سے کم نہیں ہے۔ معاشرے کی عظیم ہستیوں کے فقدان کا دکھ ہر شاعر اور ادیب نے محسوس کیا ہے۔ مختار مسعود نے اس صدمے کو اپنی کتاب ''آوازِ

دوست'' میں قحط الرجال کا نام دیا ہے تو کہیں ناصر کاظمی نے اس المیہ کو یوں بیان کیا ہے:

وہ جو لوگ اہلِ کمال تھے وہ کہاں گئے
وہ جو آپ اپنی مثال تھے وہ کہاں گئے

(رائگاں)

کھو گئی دور کہیں بانگِ درا ڈھونڈ کے لائیں
دشتِ ماضی میں چلیں اپنا پتہ ڈھونڈ کے لائیں

اب بھی صحرا میں ہو شاید وہ امانت باقی
وہی گم گشتہ نشان کفِ پا ڈھونڈ کے لائیں

(سرابوں کے صدف)

جن سے نگہ میں نور تھا دیکھتے دیکھتے وہ لوگ
کرب و بلائے زیست سے صورتِ آب اُٹھ گئے

اب یہی خام کار ہیں جامِ شراب انہی کو دے
وہ تری بزمِ ناز کے رندِ خراب اُٹھ گئے

بند آنکھ کیے کانِ جواہر میں کھڑا ہوں
گوہر مجھے یاد آتے ہیں گنجینے کے اپنے

(شاخِ تنہا)

خورشید کے نزدیک ایسے افراد کی مثال ان صحائف کی طرح ہے جو غافل لوگوں کو راہِ راست پر لانے کے لیے ہوتے تھے۔

رشتہءِ آب توڑ کر نقشِ سراب چھوڑ کر
امتِ غافلاں سے ہم مثلِ کتاب اُٹھ گئے

(رائگاں)

کسے ملے گی لرزتی لوؤں کی راہ بری
کہوں رہی ہیں وہ باب و چراغ کی رسمیں

(شاخِ تنہا)

ادب میں کسی نہ کسی انداز میں کوئی نہ کوئی مقصد کارفرما ہوتا ہے وہ تحریر کنندہ سے قاری تک کسی سے بھی منسلک ہوسکتا ہے۔ وہ مقصد صرف مسرت بہم پہچانا بھی ہوسکتا ہیاور کوئی اور مقصد بھی۔

خورشید کی غزلوں میں ہمیں اس عظیم مقصد کی خواہش بھی دکھائی دیتی ہے جو عظمتِ رفتہ کے نشان یاد رکھنے اور دوسروں کو بھی یاد رکھوانا چاہتے ہیں یعنی وہ اپنے سے جڑے رہنے کے خواہاں ہیں تا کہ ہمارا معاشرہ اس سے بالکل ہی نا بلد نہ ہو جائے۔ وہ اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ تذکرہ رفتگاں ہمیشہ سے جوش و ولولے کا سبب رہا ہے۔ ان کی یاد کو تازہ کر کے ہمیں اپنے مقام کا تعین کرنا چاہیے۔

بساطِ وقت پہ صدیوں کے فاصلے ہم لوگ
کنارِ شام و سحر میں کہاں ڈھلے ہم لوگ

نا کارواں نہ مسافر مگر جرس نہ تھمی
نہ روشنی نہ حرارت مگر جلے ہم لوگ

نہ جانے کب کوئی کروٹ ہمیں جگا ڈالے
زمیں کے بطن میں خوابیدہ زلزلے ہم لوگ

(سرابوں کے صدف)

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تہذیبی اقدار میں توازن ہی معاشرے میں خوشحالی کا ضامن ہوتا ہے اور عدم توازن جہاں انتشار کو جنم دیتا ہے وہیں افراد کے مابین خلیج کا سبب بنتا ہے ہمارے معاشرے میں اکثریت کا طرزِ زندگی سادہ ہے کیوں کہ آبادی کا ایک تہائی دیہی علاقوں میں رہتا ہے۔ شہری زندگی دیہی زندگی میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ہمیں ریاستی بنیادوں پر ایسا نظام تشکیل دینا چاہیے جہاں نظامِ زندگی کی بنیادی سہولیات کو یکسر تقسیم کر کے فرق کو کم کیا جا سکے تا کہ افرادِ معاشرہ کے مابین ربط قائم جس سے فضا مکمل طور پر سازگار رہے۔ خورشید رضوی کی غزلوں میں ان کے مخصوص انداز میں اس خلیج کا ذکر ملتا ہے۔

بے بسی اس کو کہیں ، یا کہیں ذوقِ ایثار
اپنی دھڑکن کو نمایاں نہیں کرتا دلِ زار

زیست کے چار طرف سنگِ خموشی کی فصیل
کسی جانب نہیں کھلتا کوئی بابِ اظہار

(سرابوں کے صدف)

خورشید اس خلیج کے نقصانات سے بھی آگاہ ہیں جس کا اظہار تاریخی و تہذیبی رنگ میں کرتے ہیں اور بعض اوقات یہ اندازِ بیان مافوق الفطرت خیالات کی ترجمانی بھی کرتا دکھائی دیتا ہے اس کی ایک وجہ ڈاکٹر خورشید رضوی کی داستانوں کے حوالے سے تحقیقی خدمات بھی ہیں جن سے وابستگی ان کے شعور کا حصہ بنی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

لڑکیاں قید ہیں سیلی ہوئی دیواروں میں
شاہزادہ کوئی آیا نہ کوئی شاہسوار

مکڑیاں تان کے بیٹھی رہیں روزن دل کے
کوئی سورج کی کرن ان سے نہ گزری زنہار

(سرابوں کے صدف)

ہمارے معاشرے میں لوگ غربت کی لکیر سے نیچے بھی زندگی گزار رہے ہیں۔ امیر اور غریب کے مابین فرق بہت واضح انداز میں سامنے آ رہا ہے۔ غریب طبقہ استحصال کی چکی میں ہمیشہ سے پس رہا ہے۔ اپنے حق کے لیے آواز اُٹھانے والوں کا انجام کچھ اچھا نہیں ہوتا۔ اس منافقانہ رویوں کے خلاف ڈاکٹر خورشید رضوی اپنے قلم کو اس انداز میں بروئے کار لاتے ہیں:

سر کٹایا نہیں جاتا ہے تو کٹ جاتا ہے
بات اتنی ہے کہ اس کام میں سبقت کر جا

(سرابوں کے صدف)

کیا خوفِ زیاں اُن کو جو خود کھوئے گئے ہیں
اب اس سے سوا اور تو کچھ کھو نہیں سکتے

دل میں اک خوابِ حسیں ، ذہن میں اندوہِ معاش
اور دروازے پہ ایام کی پیہم دستک

(امکان)

اس دور میں وہ لوگ کہاں جائیں خدایا
جو کانِ نمک میں بھی نمک ہو نہیں سکتے

ہر شخص کے ہاتھوں میں ہیں پتھر کی لکیریں
جو کچھ کہ ہوا نقشِ جبیں دھو نہیں سکتے

(سرابوں کے صدف)

موجودہ زمانے میں خلوص ،رواداری نا پید ہیں جب کہ دھوکہ دہی ،فریب کا پلڑا بھاری ہے ۔خورشید ایسے زمانے پر یوں تنقید کے تیر برساتے ہیں

اب فرشتوں سے بھی مل کر سوئے ظن جاتا نہیں
خوب تھے وہ دن کہ اک انساں کا دم بھرتے تھے ہم

خوب تھے وہ دن کہ وجہ خود آزاری خلوص
دوسروں کی تہمتیں بھی اپنے سر دھرتے تھے ہم

(سرابوں کے صدف)

جس معاشرے میں عدل و انصاف کا نظام آزادانہ وخود مختار نہ ہو اُن معاشروں میں نا انصافی کی بدولت شکست وریخت کا عمل معاشرے کو تباہی کے دھانے کی جانب دھکیلتا ہے۔خورشید اس تہذیبی گراوٹ کی جانب اشارہ کرتے ہیں

ہیں یہی منصف تو میرے قتل ہو جانے کے بعد
کیا تعجب ہے مجھے قاتل بھی گردانیں اگر
اہلِ دل اہلِ جہاں کے غم میں ہیں کیوں دل فگار
میں انہیں درسِ خموشی دوں مری مانیں اگر

(سرابوں کے صدف)

خورشید ایک ماہر نباض کی طرح حقائق تک پہنچتے ہیں۔ان کے ہاں معاشرتی سچ مکمل طور پر تہذیبی

شکست و ریخت کو عیاں کرتا ہے۔ معاشرے کے دوہرے معیارات دراصل اقدار سے دوری کی وجہ سے ہے۔ ایک ضرورت مند آدمی بیک وقت مختلف کرداروں میں تقسیم ہوتا ہے وہ اپنی ضرورت کے لیے کچھ بھی کرنے کی حد کو پار کرنے کی سعی کرتا ہے

ایمان بھی تنہا ہے مرا کفر بھی تنہا
مومن کوئی مجھ سا ہے نہ کافر کوئی مجھ سا

لینے نہیں دیتا کسی کروٹ مجھے آرام
اک شخص ہٹیلا مرے اندر کوئی مجھ سا

(سرابوں کے صدف)

خورشید رضوی کی غزلیات میں خدا سے ہم کلامی موجود ہے۔ جو تصورِ خدا ہمارے معاشرے میں موجود ہے اس پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں:

تو اگر شُکر کا رب ہے تو پھر اے ربِ کریم
کیا شکایت کو کوئی اور خدا ڈھونڈ کے لائیں

(سرابوں کے صدف)

خورشید رضوی اپنی شاعری میں روایتی لفظ معنی سے بھی نئے آہنگ اور رنگ پیدا کرتے ہیں مثلاً

ہوں میں وہ شمع سرِ طاق جلا کر سرِ شام
بھول جاتا ہے مرا انجمن آراء مجھ کو

رائگاں وسعتِ ویراں میں یہ کھلتے ہوئے پھول
ان کو دیکھوں تو یہ دیتے ہیں سہارا مجھ کو

(رائگاں)

یہ بات تو حقیقت ہے کہ انسان جس ماحول میں زندہ رہتا ہے اس میں رنگنا شروع ہو جاتا ہے۔ مگر خورشید اس ماحول کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں اور بے چارگی کا اظہار بھی کرتے ہیں۔

کُچھ بے حسی بھی چاہیے بہرِ سکونِ دل
ہر لرزشِ صبا کے کہے پر نہ جایئے

(شاخِ تنہا)

خورشید کے کلام میں اداسی کا عنصر موجود ہے لیکن یہ اداسی ان کے لیے کم اور اردگرد کے افراد کے لیے زیادہ ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کہتے ہیں:

''خورشید کا زندگی کے بارے میں رویہ ایک شکستہ دل شخص کا ہے میرا خیال ہے کہ دنیا سے بیزار شخص وہ ہوتا ہے جسے دنیا اور دنیا کے لوگوں سے شدید محبت ہوتی ہے، وہ ہر شخص کو خوش دیکھنا چاہتا ہے اس کا احساس یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی ایک شخص بھی تکلیف میں ہو اور جب مثالی دنیا کا یہ تصور ذہن میں رکھنے والا شخص اپنی اردگرد کی دنیا کو دیکھتا ہے تو اسے بے شمار ناہمواریاں نظر آتی ہیں شدتِ خلوص کے باعث وہ دنیا سے سخت مایوس ہو جاتا ہے''۔ ۵

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے الفاظ کی تصدیق خورشید رضوی کے ان اشعار سے ہوتی ہے:

مری مثال پُرانے شجر کی ہے 'دل پر
ہزار داغ بہار و خزاں اٹھائے ہوئے

(رائگاں)

بھرے جہاں سے الگ ہو کے ہم کلام رہے
مدام میں مرا سایہ، اداس، آپس میں

اس جہاں کے تو ہے شایاں صرف مرنے کی امنگ
لغو ہے کتنی یہاں کچھ کر گزرنے کی امنگ

(شاخِ تنہا)

آنکھ کھلنے پر ملے شاید مرادوں کا جہاں
چند صدیوں تک کہیں غاروں میں سونا چاہیے

(شاخِ تنہا)

پہاڑوں کی سیاہی سے فزوں دل کی سیاہی
وہ حُسن اب اپنی آنکھوں کو نظر آتا نہیں ہے

(سرابوں کے صدف)

آزار یہ پہلو سے نکل جائے تو اچھا
دل ہوگا تو پھر چوٹ بھی کھانی ہی پڑے گی

(امکان)

یہ دور وہ ہے کہ بیٹھے رہو چراغ تلے
سبھی کو بزم میں دیکھو مگر دکھائی نہ دو

(شاخِ تنہا)

کس طرح دنیا سے رخصت ہو پریشانی کہ ہے
ذرے ذرے کی طبیعت میں بکھرنے کی امنگ

دمبدم دستِ فنا میں سوچتا ہے اب حباب
جانے سر میں کیوں سمائی تھی ابھرنے کی امنگ

(شاخِ تنہا)

تم جس کو جانتے ہو فقط اپنی طبعِ خاص
وہ رنج ، وہ فسردہ دلی ، عام ہی نہ ہو

(رائگاں)

ہاتھ میں امید کے ہے ایک تارِ عنکبوت
آنکھ میں اک واپسیں تارِ بصارت ہے فقط

اے زباں تخمِ خموشی بو کے دیکھیں آج سے
آج تک کی گفتگو ساری اکارت ہے فقط

(شاخِ تنہا)

اجنبیت کے یخ کدوں میں دوست
خود کلامی یہ زندگی ہے فقط

ہم کہاں اور جوازِ شکوہ کہاں

نالہ اظہارِ بے کسی ہے فقط

کر حفاظت متاعِ حیرت کی
حاصلِ زندگی یہی ہے فقط

(شاخِ تنہا)

ذوقِ گویائی تو ہے پر تابِ گویائی کہاں
لفظ خود آ کر مرے ہونٹوں پہ تالے ہو گئے

(شاخِ تنہا)

ہجوم ہے مرے سینے میں ابر پاروں کا
گہر بکھیرنے والا ہوں ، رولتا ہے کوئی ؟

(شاخِ تنہا)

شریکِ شورشِ دنیا ہوں اور سوچتا ہوں
کہ شمع بزمِ طرب سے بھی چشم تر گزری

(سرابوں کے صدف)

خورشید اپنی غزل کو اندرونی شکست وریخت کا نتیجہ بتاتے ہیں جب معاشرہ اس کا شکار ہو تو کیسے ممکن ہے کہ ایک حساس شخص اس سے بچ جائے۔

ٹکڑے اُڑے جگر کے تو نکھرا غزل کا روپ
ہم سنگ باریوں کے سبب شیشہ گر ہوئے

(شاخِ تنہا)

خورشید کی غزلوں میں احساسِ تنہائی موجود ہے اور اس میں شدت اسی وقت آتی ہے جب اردگرد کی صورتحال ابتر ہو۔ معاشرے کی ابتر صورتحال فن کار کے لیے ہرگز قابلِ قبول نہیں ہوتی۔ جس سے انسان تنہائی کے جزیروں کا مکین ہو جاتا ہے۔ خورشید بھی یہی کہتے نظر آتے ہیں کہ شاید کوئی ایسا شخص ہو جو مجھے ڈھونڈ لائے جو مجھ جیسا ہو وگرنہ فی الحال ایسا ممکن تو نہیں۔ تنہائی کا مسلسل احساس رائیگانی کی جانب انسان کو لے جاتا ہے جہاں سے بیزاری کی سرحد کا آغاز ہوتا ہے۔

ترے نثار کسی ایسے غم گسار کو بھیج
کہ دل کی بھول بھلیوں سے ڈھونڈ لائے مجھے

(شاخِ تنہا)

اس انتظار میں ہوں نقشِ رائگاں ہو کر
ترا کرم کسی محراب میں سجائے مجھے

(شاخِ تنہا)

رہینِ صد گماں بیٹھے ہوئے ہیں
مگر ہم رائگاں بیٹھے ہوئے ہیں

(شاخِ تنہا)

دنیا میں جو اہلِ دل رہے ہیں
آزردہ وہ مستقل رہے ہیں

(رائگاں)

خورشید کی غزل کو پڑھتے ہوئے کہیں بھی یہ احساس جنم نہیں لیتا کہ وہ اپنا مشاہدہ بیان کر رہے ہیں بلکہ قاری کو یہ احساس اپنے حصار میں لیتا ہے کہ یہ مشاہدہ اس کو ہے اور قاری اور فنکار کی فکری مماثلت ہی تفہیمِ ادب کے نئے در وا کرتی ہے۔ خورشید تو سادگی کے ساتھ دل پہ بیتی بیان کر دیتے ہیں اور یہ دلی کیفیات ان کی ذات سے سماج کے ہر فرد کی سوچ کی عکاس بن جاتی ہے اس بات کی تصدیق خورشید کے ان اشعار سے ہوتی ہے۔

رہی ہے پردہ الفت میں مصلحت کیا کیا
عداوتوں میں ہوئی ہے مفاہمت کیا کیا

مرے عزیز وطن کی فضا نے بھر دی ہے
مری سرشت کے اندر منافقت کیا کیا

کبھی اصول کی غیرت ، کبھی زیاں کا سوال
دماغ و دل میں رہی ہے مشاورت کیا کیا

(شاخِ تنہا)

میں اندھیروں میں کبھی دل کے سہارے نہ گرا
روشنی پاکے دیا آنکھ نے دھوکہ مجھ کو

(رائگاں)

خورشید کے ہاں کیوں اور کیسے کی مباحث کا وجود نہیں ہے وہ کیا کہا ہے؟ پر زیادہ توجہ دیتے ہیں کیونکہ پیغام رساں کی اہمیت اس کے پیغام سے واضح ہو جائے گی۔

موج سے لیجئے خضر کی آمد و شد کا سُراغ
سطحِ دریا پر تلاشِ نقشِ پا مت کیجئے

(شاخِ تنہا)

خورشید کی غزلیات میں انسان کو ہر آن اس کی اہمیت سے آگاہ کیا جاتا ہے اور اس کا رُخ ہمیشہ ناممکن سے ممکن کی سرحدوں کی جانب موڑا جاتا ہے۔ خورشید کے نزدیک جب تک انسان اپنے داخل اور خارج کی تنظیم نہیں کرتا اس وقت منزلِ مقصود تک پہنچنا ممکن نہیں ہے۔

سینے میں میرے خلدِ بریں کی روش بھی ہے
دوزخ کے شعلہ شعلہ نفس کی تپش بھی ہے

(شاخِ تنہا)

یاں بُت شکن بہت ہیں کوئی خود شکن نہیں
توڑے جو خود کو ڈوب کے اپنے پسینے میں

(شاخِ تنہا)

اُڑنا ہے تو تہذیب کرو سوزِ دروں کی
یہ ورنہ کہیں آگ لگا دے نہ پروں میں

دو گام پہ تم خود سے بچھڑ جاتے ہو خورشیدؔ
اور لوگ سمجھتے ہیں تمہیں راہبروں میں

(شاخِ تنہا)

شاید کسی بھنور میں کھلے نا خدا کی آنکھ
ساحل کے خواب دیکھ رہا ہے سفینے میں

(شاخِ تنہا)

وہ آرزو بھی ہے کہ سوئے عرش لے اُڑے
اور اس کے ساتھ ساتھ زمیں کی کشش بھی ہے

(شاخِ تنہا)

انسان اُس وقت ہی منزل تک پہنچ سکتا ہے جب مکمل تیاری کے ساتھ اپنا سفر شروع کرے اُسے راستے میں آنے والی مشکلات کا اندازہ ہو۔

حدِ نظر پہ خضر بھی ہے منتظر مگر
رستے پہ ہر قدم پہ کھڑا راکھشش بھی ہے

(شاخِ تنہا)

خورشید جذبات کی اہمیت سے آگاہ ہیں لیکن وہ جذات کی ترسیل کو مشکل کام گردانتے ہیں وہ اپنے محسوسات میں زندہ رہنا چاہتے ہیں لیکن اس بات سے آگاہ بھی ہیں کہ کسی نہ کسی صورت اپنا مافی الضمیر بیان کرنے سے ہی اپنا اور دوسروں کا فائدہ ہوتا ہے۔

جذبے کی کوئی شکل بنانی ہی پڑے گی
سونے میں مجھے کھوٹ ملانی ہی پڑے گی

گو دست کشی دل کو سہاروں سے بڑی ہے
ڈوبے گی تو یہ نبض دکھانی ہی پڑے گی

(امکان)

خورشید کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو مشاہدے کو تجربے کی کسوٹی پر پرکھ کر نتائج کا استخراج کرتے ہیں وہ متوازن انداز میں تمام چیزوں کو لے کر آگے بڑھتے ہیں۔ پروفیسر اسلم انصاری کہتے ہیں:

''خورشید رضوی نے زندگی کے مظہری پہلوؤں کو، جو عناصر جمال سے خالی نہیں، داخلی تجزیوں کی صورت میں دیکھا ہے اور یوں داخلیت اور خارجیت کا ایک حسین امتزاج پیدا کیا ہے، جو ایک طرف نفسیاتی بصیرتوں کی صورت اختیار کرتا ہے تو دوسری طرف بعض قابلِ توجہ جمالیاتی تجسیمات (AESTHETIC CONSTRUCTS) کو بھی وجود میں لاتا ہے''۔ [۶]

خورشید زندگی کے مظاہر سے ہی کیفیات کو بیان کرتے ہیں اس بات کا اندازہ ان اشعار سے بخوبی

لگایا جا سکتا ہے:

زندگی گزری بہت پُر لطف بھی سنسان بھی
سردیوں کی رات میں تنہا مسافت کی طرح
اے میرے زاویہ دل میں مہکتی ہوئی یاد
اک چنبیلی کی طرح پھولتی پھلتی چلی جا

اے کرن تجھ کو بھٹکنا ہے ان آئینوں میں
ہاتھ ملتی چلی جا ، رنگ بدلتی چلی جا

(دیریاب)

مندرجہ بالا وضاحت سے ایک چیز جو سامنے آتی ہے وہ یہ کہ خورشید رضوی کی شاعری کا خمیر تہذیبی شعور کے عناصر سے گوندھا ہوا ہے۔ ہر خیال جب شعر کی شکل اختیار کرتا ہے تو تہذیب کی آگ میں کندن بن کر سامنے آتا ہے۔ ان کے ہاں قدیم تہذیبی اقدار کے چھن جانے کا احساس بھی موجود ہے تو نئی مثبت تبدیلیوں کو قبول کرنے کا حوصلہ بھی۔

خورشید ماضی سے منسلک ہونے کے باوجود قنوطی نہیں ہیں بلکہ ہر دم امید کی کرن ان کے ہاں عیاں ہوتی ہے اور اسی کی بدولت وہ فنا کو دہلیز بقا تک لانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

خورشید مکمل طور پر ادبی و معاشرتی تہذیب کے امین ہیں ان کی غزلیات میں تحرک موجود ہے جو ان کی ذات و خیالات کا پتہ دیتا ہے۔ خورشید ہر اس تبدیلی کو خواہ وہ ادبی سطح پر ہو یا معاشرتی سطح پر پسند کرتے ہیں جو تعمیری مقاصد کی حامل ہو۔ خورشید کی غزلیں نہ صرف تہذیبی شعور سے لبریز ہیں بلکہ ان کی غزلیات میں وہ تہذیب کی لفظی تصویر کشی کی گئی ہے جو انہیں اپنے معاصر شعراء میں منفرد مقام پر فائز کرتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سبطِ حسن، ماضی کے مزار، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۰۷ء، ص ۵

۲۔ آلِ احمد سرور، پروفیسر، غزل کا فن، مشمولہ: مجموعہ تنقیدات، مرتبہ عاصمہ وقار، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۴۴

۳۔ امجد طفیل، تنہائی، سراب اور رائیگانی: خورشید رضوی کی شاعری، مشمولہ: ارمغانِ خورشید، ڈاکٹر زاہد منیر عامر، پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۱۵ء، ص ۱۷۸

۴۔ پروفیسر ہارون الرشید تبسم، ڈاکٹر، خورشید سخن، مشمولہ: ارمغانِ خورشید، ڈاکٹر زاہد منیر عامر، پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۱۵ء، ص ۷۵، ۱۷۴

۵۔ خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر، خورشید رضوی اور شاخِ تنہا، مشمولہ: ارمغانِ خورشید، ڈاکٹر زاہد منیر عامر، پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۱۵ء، ص ۱۱۶، ۱۱۵

۶۔ اسلم انصاری، ڈاکٹر، سخنے چند، دیریاب از خورشید رضوی، القاء پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص xvi,xvii

باب چہارم

خورشید رضوی کی غزل کا موضوعاتی مطالعہ

۱۔ خورشید کی غزلوں میں مذہبی موضوعات

۲۔ خورشید کی غزلوں میں تصورِ عشق

۳۔ خورشید کی غزلوں میں تصورِ انسان

۴۔ خورشید کی غزلوں میں زندگی

۵۔ خورشید کی غزلوں میں سماج اور سماجی حقائق

۶۔ خورشید کی غزلوں میں 'یادِ ماضی'

۷۔ خورشید کی غزلوں میں کلاسیکی رنگ

۸۔ خورشید کی غزلوں میں رومانی رنگ

خورشید رضوی کی غزل میں موضوعاتی تنوع موجود ہے۔ ان کے ہاں زندگی کے تمام رنگ موجود ہیں جس میں ان کا اندازِ نظر مزید رنگینیاں بھر دیتا ہے۔ خورشید ایک علمی و ادبی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں بعد ازاں انہوں نے عملی زندگی میں عربی زبان کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا اور تدریسی و تحقیقی حوالے سے بھی اس سے منسلک رہے۔ اس بنا پر ان کی ادبی فکریات میں مذہبی عُنصر موجود ہے۔ لیکن کسی طور بھی اُس میں شدت نہیں آتی۔ خورشید کی مذہبی فکریات میں تصوف کا رنگ جھلکتا ہے۔

ا۔ خورشید کی غزلوں میں مذہبی موضوعات:

خورشید رضوی کی غزل میں اسلامی راسخ عقیدوں کو شعری قالب میں بہت مانوس انداز میں ڈھالا گیا ہے۔ اُردو شاعری میں زندگی و موت کا موضوع ہر شاعر نے اپنے اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔ خورشید کے ہاں بھی ہمیں اس کا اظہار ملتا ہے۔ زندگی و موت کے ساتھ عقیدہ آخرت بھی منسلک ہے جس کے تحت یہ دنیا فانی ہے اور حقیقی جہاں بعد از موت والا جہان ہے۔ خورشید اس کو اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں

حیات و موت ہماری نظر میں کچھ بھی نہیں
بس اس قدر کہ ہوا نے حباب بدلا ہے

(سرابوں کے صدف)

نہ جانے کب نہ رہیں ہم ہمیں غنیمت جان
حیات و موت میں کچھ ایسا فاصلہ بھی نہیں

(شاخِ تنہا)

موت کی ایک علامت ہے اگر دیکھا جائے
روح کا چار عناصر پہ سواری کرنا

(امکان)

کوئی زمانہ بھی ہو دکھ یہی ہیں ہونے کے
ملیں گے خاک میں ہوں لاکھ آپ سونے کے

(سرابوں کے صدف)

کر رہا ہوں ذرہ ذرہ ریگِ ساعت کا شمار
زندگانی کا اسیر اور موت کا دلدادہ ہوں

(شاخِ تنہا)

تہہِ خاک سب مسند آرائے خاک
اکیلے اکیلے اُتارے گئے

(امکان)

اسلامی تصورات میں 'جبر و قدر'، 'بقا و فنا' غیر معمولی مباحث ہیں۔ جسے علماء اپنے اپنے انداز میں بیان کرتے آئے ہیں اور سمجھنے کے ساتھ سمجھانے کی کوشش بھی جاری رہی ہے۔ خورشید ایک عالم و فاضل ہونے کے ساتھ شاعر بھی ہیں لہٰذا ان کا نقطہ نظر جہاں عالمانہ ہوتا ہے وہیں شاعرانہ انداز بھی موجود ہوتا ہے۔

جس طرح تُند ہواؤں سے اُلجھتے ہیں چراغ
عمر بھر فکرِ بقا میں رہے فانی افسوس

(دیریاب)

میں ترا، میرے قدم تیرے ، مرا رستہ ترا
اے خدا کیا خاک چل سکتا ہوں میں تیرے خلاف

(شاخِ تنہا)

کچھ فنا کے زیرِ پا ہوں ، کچھ فنا آمادہ ہوں
خاک کا پتلا ہوا کی راہ میں استادہ ہوں

(شاخِ تنہا)

کس جبرِ ہست و بود میں اُلجھی ہے زندگی
ہونا بھی ہے ضرور نہ ہونا بھی ہے ضرور

(رائگاں)

جنگ آزما ہے اپنے مقدر سے آدمی
دُھلتا نہیں یہ داغ پہ دھونا بھی ہے ضرور

(رائگاں)

ہم نے بھی بہت غور کیا رازِ جہاں پر
حکمت نہ کھلی کوئی ، مشیت کے علاوہ

(امکان)

سماں غروب کا دل میں رہا اُبھرتے ہوئے
خیال خاک میں ملنے کا تھا سنورتے ہوئے

(امکان)

ہاتھ پر خاکہ تقدیر بنانے والے
یوں تہی دست نہ در سے مجھے واپس کر دے

بقا کو لرزشِ رنگِ فنا سے پہچانا
خدا کو کشمکشِ نا خدا سے پہچانا

(رائگاں)

آسماں صبح کے آثار سے پہلے پہلے
میری قسمت کے ستارے مجھے واپس کر دے

(سرابوں کے صدف)

چھپا کے تجھ سے کہاں اپنے روز و شب لے جاؤں
جہانِ نور ترا ' اور ظلمتیں تیری

(سرابوں کے صدف)

بالخصوص برصغیر میں اسلام کی ترویج میں صوفیاء کا کردار کلیدی حیثیت رکھتا ہے انہوں نے اپنے عمل، کردار و گفتار سے پتھر دلوں کو بھی موم کر لیا ان کے اس رویے کی وجہ سے لوگ جوق در جوق اسلام کی طرف آنے لگے۔ اسلام میں دنیا کا تصور 'فنا' سے مربوط ہے۔ صوفیا نے اس پر عمل کر کے اسے ثابت کیا۔ دنیاوی آلام و آسائش سے بیزاری اور جہانِ آخر کے متعلق فکر روزِ حساب کا ڈر اور اس کی وجہ سے یادِ خدا میں مصروف رہنا ان کی زندگی کا شعار تھا۔ خورشید کے ہاں صوفیا کے نظریات کی بازگشت سنائی دیتی ہے لیکن وہ وحدت الوجود و شہود، تلاشِ ذات، تضادِ ذات جیسے دقیق مسائل میں اُلجھتے نہیں ہیں بلکہ اپنے انداز میں انہیں بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔

خدا بھی خلق میں چاہے کہ آئینہ دیکھے
اُسے بھی راس نہ آیا سرورِ یکتائی

(امکان)

تلاشِ حق ایک ایسا عمل ہے جس میں عرفاء زندگی بھر سرگرداں رہتے ہیں، ان کی زندگی کا مقصد حقیقت تک رسائی ہوتا ہے خورشید کی شاعری میں تدبر وفکر برائے تلاشِ حق کے اشعار موجود ہیں لیکن اُن میں بھی شعری چاشنی بدرجہ اتم موجود ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری کہتے ہیں:

''خورشید کی شاعری کا جذباتی مافیہ، ظاہر و باطن کی جدلیت سے اُبھرتا ہے، جس کی صورت پذیری خلوت وجلوت کے تضاد سے وجود میں آتی ہے، اس جدلیت میں جو حرکتِ آمد وشد ہے وہ خورشید کی شاعری کے باطنی تحرک کو متعین کرتی ہے''۔ [۱]

یہ مری روح میں گونجتا کون ہے
بند گنبد میں مثلِ صدا کون ہے

کون سبزے کی صورت میں پامال ہے
سرو بن کر چمن میں کھڑا کون ہے

کس سے چھپ چھپ کے ملنے کو جاتی ہے تو
جنگلوں میں بتا اے صبا کون ہے

(رائگاں)

صرف خزاں ہیں کس کے رنگ ، وجہِ بہار کون ہے
ابلقِ صبح و شام کا شاہسوار کون ہے

کچھ نہ کھلا کہ راز کیا سلسلۂ سخن میں ہے
حرف کے اس طرف ہوں میں، حرف کے پار کون ہے

(امکان)

اسلامی بنیادی نظریات میں دنیا فانی ہے اس کی حقیقت کچھ بھی نہیں ہے انسان یہاں عارضی طور پر زندگی گزار رہا ہے۔

اور کیا ہو گا جہاں کی بے ثباتی کا ثبوت
تم کہ سر تا پا حقیقت تھے کہانی ہو گئے

(شاخِ تنہا)

کسی دن اہل دنیا سے بہت دور
خدا کے بازوؤں میں جا کے روئیں

(سرابوں کے صدف)

جانے کس دن ہاتھ سے رکھ دوں کا دنیا کی زمام
جانے کس دن ترکِ دنیا کا خیال آ جائے گا

(شاخِ تنہا)

میرے لہو سے نہیں اُ س کی باز گشت سے ڈر
خروش ِ حشر ترا دامن ِ قبا ' مرا ہاتھ

(رائگاں)

فکرِ انجام میں تا زیست ہمیں الجھایا
خوب لی پیرہن ِ زیست کی قیمت ہم سے

(دیریاب)

خورشید دنیا کی رنگینیوں کو دیکھنا چاہتے ہیں لیکن اپنے انداز سے وہ ان سے عبرت حاصل کرنا چاہتے ہیں ان میں مدغم ہونا نہیں چاہتے اس لیے وہ کہتے ہیں:

یہ دور وہ ہے کہ بیٹھے رہو چراغ تلے
سبھی کو بزم میں دیکھو مگر دکھائی نہ دو

(شاخِ تنہا)

مآلِ کارِ قناعت ہے سوا بھی سے سہی
وگرنہ طولِ تمنا کی انتہا بھی نہیں

(شاخِ تنہا)

خورشید ذات کی یکسوئی کو ضروری سمجھتے ہیں ان کی شاعری میں باطن کی آواز اور اندرونی کیفیات کا ذکر جا بجا ملتا ہے

درِ خزینہ صد راز کھولتا ہے کوئی
نہ جانے کون ہے وہ مجھ میں بولتا ہے کوئی

(شاخِ تنہا)

عجب کرید عجب بے کلی سی ہے جیسے
مجھے مری رگِ جاں تک ٹٹولتا ہے کوئی

(شاخِ تنہا)

آدمی پہ تلخ ہو جاتا ہے ظاہر کا سفر
راہ میں حائل اگر باطن کی سرگوشی رہے

(شاخِ تنہا)

اک معما ہے مری ذات عجیب
بند ہیں مجھ میں تضادات عجیب

تیرنے والے کبھی ڈوب کے دیکھ
زیرِ دریا ہیں طلسمات عجیب

(رائگاں)

سوال کرنا انسان کی فطرت میں شامل ہے، کائنات کی گوناگوں رنگینیاں اسے اپنے سحر میں مقید رکھتی ہیں، معلوم و نامعلوم، حاصل و لاحاصل کی جانب سفر جب اُسے تھکا دیتا ہے اور جب اپنے اردگرد نگاہ دوڑاتا ہے تو ہر ایک کو اس کیفیت میں حیران دیکھ کر اُسے واحد ہستی خدا کی نظر آتی ہے جس سے اپنا حالِ دل بیان کر سکتا ہے کیوں کہ سب کچھ اُسی کے علم سے وجود میں آیا اور وہ ہی اس کی غرض و غایت سے واقف ہے۔ خورشید بھی کچھ ایسی کیفیات کے سبب خدا سے سوال کرتے ہیں۔

حیران ہیں اہلِ دل خدایا
کیا تو نے یہ سلسلہ بنایا

جس چیز پہ شوق سے نظر کی
اس چیز نے ہم سے منہ چھپایا

جو صفحۂ دہر پر نہیں تھا
کیوں خواب میں وہ چمن دکھایا

کانٹوں نے پاؤں میں خلش کی
پھولوں کی طلب نے دل دُکھایا

(امکان)

۲۔ خورشید کی غزلوں میں تصورِ عشق

اُردو شاعری میں دفتر کے دفتر تصورات و معاملاتِ عشق سے بھرے پڑے ہیں۔ شعراء نے اپنی اپنی بصیرت اور فہم کے مطابق ان کو نظم کیا ہے۔ عام طور پر عشق کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، عشقِ حقیقی و عشقِ مجازی۔ عشقِ حقیقی میں خدا کی ذات، اس کی صفات اور ان کے مظاہر سے محبت کا اعلان موجود ہوتا ہے اس کا زیادہ مجموعہ صوفیاء کے ہاں ملتا ہے۔ جب کہ مجازی عشق میں ایک گوشت پوست کے انسان کے بصورتِ محبوب کیفیات کا بیان ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مجازی عشق ہی حقیقی عشق کی جانب زینے کا کام دیتا ہے۔ خورشید کی شاعری میں عشق کا تصور دونوں صورتوں میں موجود ہے لیکن رقیق و سطحی نہیں ہے بلکہ وہ اپنے انداز میں اس کے تار بنتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک عشق میں اپنی ہستی سے گزر جانا ہی بقا ہے۔

ریزہ ریزہ میری ہستی کو بہا کر لے جا
اے مرے عشقِ بلا خیز ٹھہرنا کیسا

(رائگاں)

خورشید کی شاعری میں تصورِ عشق اپنے آپ سے مکمل آگہی کا عمل ہے۔ وہ اپنے مطلوب کو اپنے بارے میں مکمل آگہی دینے کے قائل ہیں جس میں خوبیاں بھی ہوسکتی ہیں اور خامیاں بھی ہر وہ بات جس کا ادراک اس کو اپنے بارے میں ہے۔

تم مجھ سے نہ مل پاؤ گے ہرگز کہ میرے گرد
دیوار ہی دیوار ہے دروازہ نہیں ہے

(رائگاں)

عشق ایثار و خلوص کے بے لوث جذبے کا نام ہے جہاں چاہے جانے کے عمل میں کسی قربانی سے گریز ممکن نہیں، برداشت کی حدود کا تعین ہی نہیں، بس حکم و رضا کی خاطر سرِ تسلیم خم ہونا چاہیے۔

میں تیرے لیے ٹوٹ گیا ذات سے اپنی
تو سے خطِ تنسیخ نہ کھینچا من و تو پر

(رائگاں)

وفا اور جفا شعرا کے محبوب موضوعات رہے ہیں جسے ہر کسی نے اپنے انداز میں سپردِ قرطاس کیا ہے لیکن خورشید کے ہاں ان کا اظہار ایک ایسے تجربے کے نتیجے کی طرح ہے جس میں تغیر و تبدل ممکن ہی نہیں

وفائے یار سے بھی بے نیاز ہے اب دل
جفائے یار بھی کیا منہ دکھانے آئے گی

(امکان)

خورشید عشق کا بیان ایک جذبے کے تحت نہیں کرتے بلکہ مکمل ادراک کے ساتھ اور روایتِ عشق و عشاق کو ذہن میں رکھتے ہوئے کرتے ہیں۔

مجھ سے جو یہ کہتے ہو مٹا دے گا تجھے عشق
کچھ یہ بھی تو فرما دیا ہوتا کہ رہا کون

(دیریاب)

خورشید کہتے ہیں محبت و عشق کے معاملات ناکامی کے باوجود بھی دنیا کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔اور اس ناکامیِ عشق میں بھی لوگوں کے لیے سیکھنے کو بہت کچھ موجود ہے اور کچھ نہ سہی تو اندازِ محبت ہی سہی

ہم تری راہ میں ناکامِ محبت ہی سہی
پھر بھی سیکھی ہے زمانے نے محبت ہم سے

(دیریاب)

۳۔ خورشید کی غزلوں میں تصورِ انسان:

خورشید کی شاعری میں انسان کا تصور مکمل سماجی حوالوں سے موجود ہے۔ وہ انسان کی شکل پہلے ذات کے آئینے میں دیکھتے ہیں بعد ازاں اسے سماج کے زاویے سے پرکھتے ہیں۔ان کے ہاں داخل میں جو اہمیت دل کی ہے وہ کسی اور کی نہیں خورشید آدمی کی تشکیلِ ذات میں دل کو اہمیت دیتے ہیں

آدمی دل کے سویدا سے عبارت ہے فقط
ایک ہی پتھر پہ قائم یہ عمارت ہے فقط

(شاخِ تنہا)

جسم کو پابندِ رسمِ کارواں رہنا پڑا
تھی مگر دل کی روش سب سے الگ سب سے خلاف

(شاخِ تنہا)

انسان کے ظاہر و باطن میں موجود تضادات اس سماج کے دوہرے معیارات کا نتیجہ ہیں جس کی وجہ سے ہمیشہ انسان کشمکش کا شکار رہتا ہے

آدمی پر تلخ ہو جاتا ہے ظاہر کا سفر
راہ میں حائل اگر باطن کی سرگوشی رہے

(شاخِ تنہا)

ایمان بھی تنہا ہے میرا کفر بھی تنہا
مومن کوئی مجھ سا ہے نہ کافر کوئی مجھ سا

(سرابوں کے صدف)

تو نے میرے خمیر میں کتنے تضاد رکھ دیے
موت میری حیات میں نقص مرے کمال میں

(رائگاں)

ہر اک آغاز پر سو خواب دیکھیں
ہر اک انجام پر پچھتا کے روئیں

(سرابوں کے صدف)

خورشید کے نزدیک انسان کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز عاجزی وانکساری ہے، وہ غرور وتکبر کو نا پسند کرتے ہیں علم و ہنر کو سراب گردانتے ہوئے کہتے ہیں

سرابِ علم و ہنر پر نہ بھولنا خورشید
جس آدمی کے نہ دیکھو فروتنی دل میں

(سرابوں کے صدف)

لیکن اس عاجزی وانکساری کو ایک حد تک رکھنے کے قائل ہیں کیونکہ گوشہ نشینی آج کے اس تیز رفتار دور میں اپنی معاشی وسماجی ذمہ داریوں سے فرار ہے۔ خورشید کہتے ہیں

ہم نمائش کے تو قائل نہیں لیکن خورشید
خود کو پنہاں بھی زمانے سے نہ کر پیدا ہو

(امکان)

کر کُچھ ایسا کہ تری خاک میں پرواز آئے
اب کوئی اسپِ فلک سیر ، اسی توسن سے نکال

(دیریاب)

خورشید کی غزلوں میں 'خاک' کا استعارہ نہایت بلیغ معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ چند اشعار دیکھیے :

مجھ میں کیا کیا ہے کہیں سونا کہیں انبارِ خاک
خاک میں ملتا ہوں اور کھُلتے نہیں اسرارِ خاک

شرط سجدے کی کروں پوری تو دامن بھر سکوں
کانِ زر میں سر جھکاتا ہی نہیں پندارِ خاک

جانے کیوں ہر چیز اپنی اصل سے وحشت میں ہے
نور ہے ظلمت فشاں اور خاک ہے بیزارِ خاک

(دیریاب)

انسان میں موجود غرور و تکبر کو خورشید نے اپنے مخصوص انداز میں معنی آفرینی کے ساتھ نظم کیا ہے جو انہی کا خاصہ ہے۔

خوں رُلاتی ہے رعونت ، دل دکھاتا ہے تضاد
خاک پر جب کِبر سے ڈالے نظر کُہسارِ خاک

(دیریاب)

میں تو خود خاک ہوں میرا تو بھلا کیا مذکور
آسمانوں سے ستاروں کو بلاتی ہے یہ خاک

(امکان)

۴۔ خورشید کی غزلوں میں زندگی

اُردو شاعری کا محور انسان ہے۔ اس کے نظریات، اس کا ماحول، اس کی باتیں، اس کی کیفیات وغیرہ انسان اپنے رہن سہن سے ماحول کی تشکیل کرتا ہے اور اس میں موجود اقدار انسان کے مجموعی تصور حیات کو اُبھارتی ہیں۔ خورشید کی شاعری میں موجود تصورِ حیات اس کے اردگرد کے ماحول سے جنم لیتا ہے۔ وہ ہر انداز سے اس کا مشاہدہ کرتے ہیں اور پھر اس کو سپردِ قلم کرتے ہیں۔ کسی بھی فنکار کے لیے اظہار نہایت ضروری ہوتا

ہے کیوں کہ تخیل کا مخصوص شکل میں اظہار انسان کو حوصلہ اور صبر دیتا ہے۔ وہ اظہار شاعرانہ پیمانے میں بھی ہوسکتا ہے، مصوری کے قرینے بھی ممکن ہے سنگیت کے سنگم سے بھی کیا جا سکتا ہے الغرض فنونِ لطیفہ یا فنکار کے فن کا اظہار یہ کیتھارسس ہی ہے جو معاملاتِ زندگی کو اپنے فنی ملبوس میں لپیٹ پر پیش کرنے کا نام ہے۔ جمیل یوسف کہتے ہیں:

> ''زندگی کی بے معنویت اور رائیگانی کا یہ شاعرانہ اظہار دراصل اس غم واندوہ میں کیتھارسس کی ایک صورت ہے جو زندگی کی تلخ حقیقت سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ کیتھارسس انسان کو صبر اور حوصلہ عطا کرتا ہے اور اسے زندگی کی تلخیاں ہنسی خوشی برداشت کرنے کی سکت بہم پہنچاتا ہے''۔ ۲

نہ تھی پہاڑ سے کچھ کم مگر مصیبتِ عمر
ترے خیال میں گزری تو مختصر گزری

(سرابوں کے صدف)

تاروں کو شمار کر رہا ہوں
کیا کیا ہوا عمر مختصر میں

(رائگاں)

بہتا ہوا سفینۂ عمرِ دو روزہ میں
خوابیدہ جائے گا کوئی بیدار جائے گا

(رائگاں)

انسان کو ڈٹ کر زندگی کی تلخ حقیقتوں کا سامنا کرنا چاہیے۔ کہا جاتا ہے کہ مشکل ترین کام کو سب سے پہلے کرنا چاہیے تا کہ باقی کام آسان نظر آنے لگیں۔ مشکلات سے دوری اختیار نہیں کرنی چاہیے کیوں کہ زندگی پھولوں کی سیج نہیں ہے کہیں نہ کہیں حقائق سے سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔ جب انسان حقیقت سے منحرف ہو کر جاتا ہے تو خواب اسے گھیر لیتے ہیں اور خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لیے عملی میدان میں خیمہ زن ہونا پڑتا ہے اور عمل آپ کو حقیقت کے روبرو کرتا ہے۔ خورشید نے اس کیفیت کو بیان کیا ہے

بھاگے حقیقتوں سے تو خوابوں میں گھر گئے
موندی جو آنکھ، آنکھ میں بھر آئے آئینے

(رائگاں)

زندگی کے شب و روز کو سنوارنے کے لیے انسان سر توڑ کوشش کر رہے ہیں ہر شخص اپنے انداز میں زندگی کے خدو خال سنوار رہا ہے لیکن اس میں وہ اپنے دوسرے انسانی رشتوں کو یکسر فراموش کر بیٹھا ہے۔

سب کے سب اپنے گریبانوں میں ہیں ڈوبے ہوئے
گُل سے گُل تک رشتۂ موجِ صبا کوئی نہیں

(شاخِ تنہا)

خورشید کے ہاں آج کے سماج میں عام آدمی کی زندگی کے تلخ حقائق کا ذکر ان الفاظ میں موجود ہے

دن کو کرتی ہے کڑی دھوپ چمن کو پامال
شب کو آتی ہے اُڑاتی ہوئی شب دیز ہوا

(امکان)

۵۔ خورشید کی غزلوں میں سماج اور سماجی حقائق

اُردو شاعری دراصل اپنے سماج کی ہمیشہ سے آئینہ دار رہی ہے۔ کلاسیکی ادب سے لے کر آج تک کے شعرا نے معاشرتی مسائل کو شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ شاعری سے اس کے عہد کی تصویر کو بخوبی دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ خورشید رضوی ایسے شعرا میں شمار ہوتے ہیں جو معاشرے کو اپنی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس میں مثبت تبدیلیوں کو سراہتے اور منفی تبدیلیوں پر قلم اُٹھاتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں مفاد پرستی کا رجحان بہت زیادہ ہو چکا ہے۔ تعلق کی بنیاد ہی مفادات پر استوار کی جاتی ہے۔ ایسے میں عام آدمی کی نظر سے خورشید ہمیں معاشرہ دکھاتے ہیں

دیکھنے میں کتنے پائندہ سہارے تھے مگر
ہاتھ میں آئے تو سب مکڑی کے جالے ہو گئے

(شاخِ تنہا)

کوئی بھی کام نہ آیا شکستہ بالی میں
صبا بھی شاخِ نشیمن کو کاٹ کر گزری

(سرابوں کے صدف)

خورشید نے معاشرے کے مجموعی رویوں کو بڑی چابکدستی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

مرے عزیز وطن کی فضا نے بھر دی ہے
مری سرشت کے اندر منافقت کیا کیا

(شاخِ تنہا)

معاشرے کا اصول ہے جب تک عملی طور پر کسی کے کام آتے رہو گے یاد رکھے جاؤ گے جیسے ہی عمر ڈھلنے لگتی ہے تو انسان میں پہلے جیسی پھرتی اور تیزی نہیں رہتی جس کی وجہ سے آپ جہاں منظر عام سے ہٹتے ہو وہیں افراد کے ذہنوں میں بھی نقشِ رائگاں بن جاتے ہو۔ خورشید نے ایسے افراد کی داستان کو ایک شعر میں بیان کیا ہے۔

جب ہم ہرے بھرے تھے تو تھے وقفِ دشت و در
دن ڈھل گئے تو صحنِ چمن میں لگا دیا

(شاخِ تنہا)

عام آدمی کی زندگی مصائب و آلام کو جھیلتے ہی گزر جاتی ہے۔ خورشید زندگی کی مصیبتوں کو اس دنیا میں رہنے کی شرط سے تعبیر کرتے ہیں

چار دن کو ہے یہاں شرطِ اقامت کیا کیا
فرصتِ زیست میں شامل ہے مصیبت کیا کیا

(شاخِ تنہا)

یہ دنیا ہر موڑ پر دل کو آزار دیتی ہے۔ خورشید کسی ایسی جگہ کی خواہش کرتے ہیں جہاں دل کو کوئی نہ دکھائے۔ مظلوموں کا استحصال نہ کیا جائے۔

کہاں چلوں کہ جہاں دل دُکھا سکے نہ کوئی
کسی پہ اپنی خدائی جتا سکے نہ کوئی

(شاخِ تنہا)

خورشید کے نزدیک منبر و محراب ہماری تہذیب کا استعارہ ہیں جہاں سے ہمارے لوگوں کی مجموعی معاشرتی، اخلاقی مذہبی تربیت کی جاتی تھی لیکن آج یہ سب نہیں ہو رہا۔ یا آج کے افراد میں وہ ذوقِ سماعت نہیں یا صاحبانِ علم و ہنر کے پاس وہ گفتار نہیں

گونج کا زنگ لگا جاتا ہے محرابوں کو
لوٹ لوٹ آتی ہے محرومِ سماعت گفتار

(سرابوں کے صدف)

خورشید کی غزل میں معاشرے کے ہر رنگ کا استعمال موجود ہے۔ وہ باریک بینی سے مشاہدہ کرتے ہیں بعدازاں اسے شعر کے قالب میں ڈھالتے ہیں۔

معصوم طائروں کے لیے دل گرفتہ ہوں
ان کو بھی آدمی کا عمل مار جائے گا

(رائگاں)

پھول کھلنے کی کوشش سے اکتا گئے
آنکھ بھر کر انہیں دیکھتا کون ہے

(رائگاں)

کچھ بار ہے لُطفِ دشمناں کا
کچھ رنج جفائے دوستاں ہے

(امکان)

ہم کو آیا ہی نہیں بزمِ جہاں کا اعتبار
اس کے ہر اقرار میں پنہاں کوئی انکار تھا

(رائگاں)

دل میں اک خوابِ حسیں ذہن میں اندوہِ معاش
اور دروازے پہ ایام کی پیہم دستک

(امکان)

وہ بھی ہیں بہت عقل پہ نازاں کہ جنہوں نے
خلقت پہ نئے ظلم کے انداز نکالے

(امکان)

لبوں سے نیم تبسم بھی اُٹھ گیا خورشید
اداسیوں کا مداوا تلاش کرتے ہوئے

(امکان)

ستارے سُرخ ہوتے جا رہے ہیں
ہر اک تقدیر جلتی جا رہی ہے

(رائگاں)

کیوں پہاڑوں کو امانت سے سبکدوش کیا
آدمی پر غم و آلام کی یورش کیوں ہے

(دیریاب)

زمانہ لب پہ انگشت رکھ کے کہتا ہے
کہ دردِ دل نہ کہو اور کہو تو ڈرتے ہوئے

(امکان)

جو میرے دل میں ہے خورشید مجھ کو لکھنا ہے
بلا سے آئے تہہِ خنجر جفا مرا ہاتھ

(رائگاں)

۶۔ خورشید کی غزلوں میں 'ماضی کی بازگشت

ویسے تو اُردو شاعری میں تقریباً ہر شاعر کے ہاں ہمیں ماضی کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ جس میں ماضی کے حسین لمحوں کو یاد کر کے لطف اندوز ہوا جاتا ہے یا ''چھین لے مجھ سے حافظہ میرا'' والی کیفیت ہوتی ہے۔ انسان تمام زندگی کسی نہ کسی انداز میں اپنے ماضی سے جُڑا رہتا ہے، کبھی آباء واجداد کے بہادری کے واقعات، کبھی علمی و ادبی ورثے کی بازگشت، کبھی حالات و واقعات کا تذکرہ غرض زندگی کا کوئی نہ کوئی پہلو ماضی سے متعلق زندگی میں موجود رہتا ہے۔

خورشید رضوی کے ہاں بھی ہمیں 'یادِ ماضی' نمایاں انداز میں نظر آتی ہے ان کے ہاں ماضی سے وابستگی غم کے دائرے میں نہیں ہے بلکہ وہ اس سے تہذیب و ترویج کا کام لیتے ہیں۔ ماضی کی تصویر زندگی کے حسین و دلکش رنگوں سے مزین نہیں ہوتی بلکہ اس میں بدنما دراڑیں بھی موجود ہوتی ہیں۔ خورشید رضوی کے ہاں ایسی

یادوں کے انبار موجود ہیں جو ہر لمحہ موجود میں انہیں اپنے ساتھ منسلک رکھتے ہیں۔

نفس نفس وہی یادوں کے ہشت پہلو کٹار
کہ جس کی دھار پہ کٹ کٹ کے دل پگھلتا جائے

(شاخِ تنہا)

چلو کہ دیکھ تو آئیں زمینِ اعدا میں
وہ اپنی جان سے پیارے مکاں ، وہ گھر اپنے

(شاخِ تنہا)

رو رہا ہوں ہر پُرانی چیز کو پہچان کر
جانے کس کی روح میرے روپ میں لائی گئی

(شاخِ تنہا)

مذکورہ بالا شعر میں ایک مکمل داستانِ الم پوشیدہ ہے، ایسے لوگوں کی داستان جن کے عروج کی حقیقت وقت کے آئینے میں شکستوں کی گرد سے معدوم ہو چکی ہو۔ خورشید کے ہاں موجودہ ابتری کا ماضی کی برتری کے ساتھ تقابل بھی ہے اور خوشگوار یادوں سے کشید کیا گیا عطر بھی ہے جس سے لباسِ حال کو معطر کیا جا سکے۔

یاد ایامے ، کوئی وجہِ پریشانی تو تھی
آنکھ یوں خالی نہیں تھی اس میں حیرانی تو تھی

(ایضاً)

علمِ نفسیات میں ماضی کی جانب رغبت کو (ناسٹیلجیا) کہا جاتا ہے۔ ایک دور تھا جب اسے ایک بیماری سمجھا جاتا تھا مگر آج یہ ایک مکمل اصطلاح کی شکل اختیار کر چکی ہے اور بالخصوص ادب میں اس کے جائزے اور تجزیے پیش کیے جا رہے ہیں۔ نوید صادق کہتے ہیں:

''خورشید رضوی کی شاعری میں ناسٹیلجیائی منظر نامہ یا اس سے جُڑا احساس اپنے ہم عصر شعرا کی نسبت زیادہ دکھائی دیتا ہے یوں تو یہ احساس کم و بیش ہر شاعر کے ہاں کسی نہ کسی رنگ میں موجود ہے مگر خورشید رضوی کے ہاں اس سے متعلقہ کیفیتوں کا اظہار جس شدتِ احساس کے ساتھ ہوا ہے وہ دوسروں کے ہاں خال خال ہی نظر آتا ہے۔ خورشید رضوی ماضی میں بہت وقت گزارتے ہیں''۔ [۳]

رائگانی کا احساس جب شدت اختیار کرتا ہے تو اس سے دو صورتیں جنم لیتی ہیں یا تو انسان قنوطی انداز اپنا لیتا ہے یا پھر اس احساس کو ختم کرنے کا خیال دل سے لگائے کوششیں کرتا جاتا ہے۔ خورشید کے ہاں موخر الذکر صورتحال موجود ہے وہ امید کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ لیکن احساس کی شدت اور اس کا اظہار بھی کم نہیں ہوتا۔

رہینِ صد گماں بیٹھے ہوئے ہیں
مگر ہم رائگاں بیٹھے ہوئے ہیں

بظاہر ہیں بھری محفل میں لیکن
خدا جانے کہاں بیٹھے ہوئے ہیں

ستارے ہیں کہ صحرائے فلک میں
بھٹک کر کارواں بیٹھے ہوئے ہیں

کھنچی ہیں دل پہ پتھر کی لکیریں
نقوشِ رفتگاں بیٹھے ہوئے ہیں

ہمیں چاہو ہماری قدر کر لو
تمہارے درمیاں بیٹھے ہوئے ہیں

(شاخِ تنہا)

گزرے لمحوں کی ہر ایک ساعت خورشید کی شاعری میں موجود ہے۔

مدتیں گذریں مگر اے دوست! ترے نام پر
ڈول جاتی ہے مرے دل کی ترازو آج بھی

(شاخِ تنہا)

معاشرے کی بگڑتی صورتحال اقدار کے زوال کا نتیجہ بھی ہوتی ہے اور سبب بھی تہذیبی اقدار کے زوال کا دُکھ خورشید کے ہاں موجود ہے۔ اور انسان اس معاشرے میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے کیوں کہ کچھ بھی تو ویسا نہیں ہوتا جیسا ماضی میں موجود تھا۔

دل آج بھی چراغ اُسی انجمن کا ہے
صدیاں گزر گئیں جسے زیر و زبر ہوئے

(شاخِ تنہا)

اُس اک ستوں کی کیفیتِ گو مگو نہ پوچھ
ملبے کے ڈھیر میں ہو ، جو تنہا کھڑا ہوا

(شاخِ تنہا)

جن لوگوں میں رہتا ہوں میں ان جیسا نہیں ہوں
ہوں کون، مجھے اپنا زمانہ نہیں ملتا

(شاخِ تنہا)

خورشید رضوی کی اس یادِ ماضی میں بھی ارتقائی عمل موجود ہے جو ان کے مجموعہ ہائے کلام میں موجود کلام سے اندازہ لاگایا جا سکتا ہے۔ ان کے ہاں تشبیہوں اور استعاروں کی مدد سے بھی ماضی کو یاد کرنے کا عمل جاری رہتا ہے جس سے ایک بات واضح ہوتی ہے کہ شاعر وقت کے نا پلٹنے کو حقیقت جان کر یادوں کے صحرا میں بادیہ پیمائی میں مصروف ہے۔

میں شب و روز کا حاصل اُسے لوٹا دوں گا
وقت اگر میرے کھلونے مجھے واپس کر دے

(سرابوں کے صدف)

کبھی ملو تو چلیں پھر انہی پہاڑوں میں
کہ پتھروں پہ پرانی عبارتیں جاگیں

(سرابوں کے صدف)

کھو گئی دور کہیں بانگِ در ، ڈھونڈ کے لائیں
دشتِ ماضی میں چلیں اپنا پتہ ڈھونڈ کے لائیں

اب بھی صحرا میں ہو شاید وہ امانت باقی
وہی گم گشتہ نشانِ کفِ پا ڈھونڈ کے لائیں

(سرابوں کے صدف)

خورشید کا شعری سفر ماضی کی یاد اس کے کرب سے حکمت و اصلاح کی جانب سفر کرتا ہے۔

ہم کھوئے ہوئے لوگوں کو ڈھونڈے گا بھلا کون
اب اپنی خبر خود ہمیں لانی ہی پڑے گی

(امکان)

اب وہ آنکھیں نہیں ملتیں کہ جنہیں آتا تھا
خاک سے دل جو آٹے ہوں ، انہیں جاری کرنا

(امکان)

ہاں وہی دشت وہی گم شدگی اچھی تھی
اب کے بھٹکوں تو مجھے راہ پہ لائے نہ کوئی

(امکان)

لرزاں ہے شاخِ دل پر اک یاد کا نشیمن
تپتے ہوئے دنوں کی مہکی ہوئی شبوں میں

(امکان)

اب بھی کبھی یاد آئے جو وہ سروِ خراماں
دل میں کوئی طائرِ پرواز نکالے

(امکان)

خورشید آج ایک خرابے کے سائے میں
سو بار ہم پہ عمرِ گزشتہ گزر گئی

(دیریاب)

۷۔ خورشید کی غزلوں میں کلاسیکی رنگ

خورشید کی شاعری میں کلاسیکی انداز نمایاں ہے جس کی بڑی وجہ قدیم تہذیبی روایت و شعری روایت سے ان کا نہ ٹوٹنے والا رشتہ ہے۔ اس کی نوعیت جذبات و احساس سے لے کر مکمل زندگی کا احاطہ کرتی ہے۔ خورشید کلاسیکی قالب میں نئے خیال کی روح پھونکتے ہیں جس کی بدولت ان کا انداز انہیں بیک وقت کلاسیکیت سے بھی جڑا رہتا ہے اور رومانویت و جدیدیت سے بھی۔

دیکھتا ہوں پھول اور کانٹے بہر سو آج بھی
یاد کرتا ہوں تری خوشبو ، تری خو آج بھی

زیست کے خستہ شکستہ گنبدوں میں گاہ گاہ
گونجتا ہے تیری آوازوں کا جادو آج بھی

(شاخِ تنہا)

ڈاکٹر وزیر آغا کہ یہ رائے خورشید رضوی کی پہلی کتاب ''شاخِ تنہا'' کے حوالے سے ہے۔ لیکن ہمارے موضوع کو واضح کرتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''خورشید رضوی کی کے زیرِ نظر مجموعے میں کلاسیکیت اور رومانویت کا سنجوگ دکھائی دیتا ہے۔ وہ لفظ کو تراشنے اور سنوارنے کا گُر جانتا ہے جس کے نتیجے میں اس کے اشعار نگینوں کی طرح لو دیتے ہوئے آتے ہیں، مگر صناعی کے عمل کے ساتھ ساتھ اس نے زاویہ نا گاہ کی تازگی کو بھی ہر جگہ برقرار رکھا ہے اور پٹی ہوئی اور پامال شعری فضا سے باہر آنے میں کامیابی حاصل کی ہے''۔ [۴]

آنکھ میچو گے تو کانوں سے گزر آئے گا حسن
سیل کو دیوار و در سے رابطہ کوئی نہیں

کب نکلتا ہے کوئی دل میں اتر جانے کے بعد
اس گلی کی دوسری جانب کوئی رستہ نہیں

لبوں پہ آج سرِ بزم آ گئی تھی بات
مگر وہ تیری نگاہوں کی التجا کہ 'نہیں'

(شاخِ تنہا)

۸۔ خورشید کی غزلوں میں رومانوی رنگ

خورشید کی شاعری میں رومانوی رنگ معنی کی نئی پرتیں کھولتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ رومانویت، جدیدیت میں انفرادیت کا رنگ رکھتے ہیں۔

کٹ گیا دورِ خزاں فصلِ بہار آ بھی گئی
دیکھتے ہیں اب ہمیں کس بات کا دھڑکا لگے

(شاخِ تنہا)

دل کے معاملوں میں زباں معتبر نہیں
ہے معتبر نظر سے نظر کا کہا ہوا

(شاخِ تنہا)

جم گیا ہے جب سے دل میں سر کٹانے کا خیال
ہم کو جانے کیا نظر آنے لگا تلوار میں

(شاخِ تنہا)

ڈاکٹر وزیر آغا رقمطراز ہیں:

''جب اس کے ہاں معاشرتی قدروں کے احترام کے ساتھ ساتھ خول سے باہر آنے کی روش بھی وجود میں آتی ہے شاید اسی لیے یہ کہا گیا ہے کہ رومانویت مغز کی طرح ہے اور کلاسیکیت اس چھلکے کی طرح ہے جو اس مغز کو اپنی آغوش میں لیے ہوتا ہے۔ مگر جب تخلیق کا لمحہ آتا ہے تو مغز چھلکے کو توڑ کو باہر کو لپکتا ہے۔ اور شگفتنِ ذات کا پیچیدہ عمل شروع ہو جاتا ہے۔ خورشید رضوی کے اشعار کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے بار بار یہ احساس ہوا کہ اس کے ہاں رومانی اور کلاسیکی دونوں رویوں نے قدم قدم پر ایک دوسرے سے مصافحہ کیا ہے جس کے نتیجے میں اس کے ہاں ایسا شعری مواد وجود میں آیا ہے جو کلاسیکی رکھ رکھاؤ سے عبارت بھی ہے اور رومانی لپک کا حامل بھی''۔ ۵

قدم گو کارواں کے ساتھ ہے پامال راہوں پر
مگر سب سے الگ اک رہ گزر در پیش ہے دل کو

(سرابوں کے صدف)

پھولوں کے مہکنے سے، سبزے کے لہکنے سے
کیوں ربط ہے باطن کو کیوں خون مچلتا ہے

(رائگاں)

تم نے اے اہلِ خرد چھان لیے ہفت افلاک
خاک ویرانہءِ دل کی نہیں چھانی افسوس

(دیریاب)

خورشید رضوی کی غزلوں میں موضوعات کا تنوع ملتا ہے۔ وہ اپنی غزلوں میں محض روایتی موضوعات کو لے کر نہیں آتے بلکہ ان ی غزلوں میں مختلف اور عہد جدید کے موضوعات بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔ خورشید رضوی مذہبی موضوعات جو اپنی غزلوں کا حصہ بناتے ہیں اور اس میں تصوف کو نمایاں طور پر فوقیت دیتے ہیں۔ البتہ ان کے ہاں مذہب اور تصوف انسان کو راہِ فرار اختیار کرنے کی بجائے محنت اور حرکت کا درس دیتا ہوا نظر آتا ہے۔ خورشید کے ہاں تصور انسان اپنے وسیع تر معنوں میں نظر آتا ہے وہ اقبال کی طرح انسان کو اپنے کھوئے ہوئے مقام کی تلاش میں مگن کرنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ اپنے گردوں تک پہنچ سکے۔ خورشید رضوی کئی غزلوں میں انسان کو زندگی میں درپیش جن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان کا بھی بیان نمایاں طور پر ملتا ہے۔ وہ سماج میں ہونے والی نا انصافیوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے ہیں۔ یوں خورشید رضوی کی غزل ایک عام آدمی کی آواز بن کر سامنے آتی ہے۔ خورشید کے ہاں جو تصور عشق پایا جاتا ہے وہ محض خیالی دنیا کی داستان نہیں ہے بلکہ ایک متحرک جذبے کی مکمل عکاسی ہے۔ وہ قوت عشق سے ناممکنات تک رسائی حاصل کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ خورشید رضوی کی غزل ان کی اپنی ہمہ جہت شخصیت کی طرح موضوعات کے تنوع کو اپنے اندر سمیٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ ہی خوبیاں ان کو ادبی افق پر نمایاں کرتی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ اسلم انصاری، ڈاکٹر، خیال وخواب کی وسعتوں جھلملاتے لمحے، ارمغانِ خورشید، ڈاکٹر زاہد منیر عامر، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۸۹

۲۔ جمیل یوسف، خلوت گزین اور گوشہ نشین، ارمغانِ خورشید، ڈاکٹر زاہد منیر عامر، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۹۵

۳۔ نوید صادق، خورشید رضوی کا ناسٹیلجیا، مشمولہ: ماہنامہ فانوس، مدیر، خالد علیم، شمارہ ۸، ۷، ۶ (جون، جولائی، اگست) ۲۰۱۷ء، ص ۸

۴۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، پیش لفظ، شاخِ تنہا، کلیات یکجا، خورشید رضوی، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، اشاعتِ دوم، ۲۰۱۲ء، ص ۱۳

۵۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، پیش لفظ، شاخِ تنہا، کلیات یکجا، خورشید رضوی، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، اشاعتِ دوم، ۲۰۱۲ء، ص ۱۲

باب پنجم

مجموعی جائزہ

مجموعی جائزہ

انسان ازل سے ہی اپنے اظہار کے لیے نئے سے طریقے اور وسیلے تلاش کرتا رہا ہے انہیں کھوج شدہ طریقوں میں ایک طریقہ شاعری کا بھی ہے جسے کئی تخلیق کاروں نے اپنایا ہے اور اپنے منفرد انداز بیان سے اپنے مافی الضمیر کو پیش کیا ہیزیادہ تر شاعروں نے اپنے اظہار کے لیے غزل کے راستے کو اختیار کیا ہے کثرت استعمال اور وقت کے ساتھ ساتھ غزل کی ساخت اور موضوعات میں بھی کئی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اگر دیکھا جائے تو آج کی اُردو غزل بھی اپنی ادبی تاریخ سے زیادہ اپنے تخلیقی بہاؤ میں مگن ہے وہ دیکھی اور ان دیکھی دنیا کی باتیں کرتی ہوئی اپنے لیے نئے سے نئے راستے تلاش کرتی ہوئی کبھی طبیعی اور کبھی مابعد طبیعی موضوعات کو زیر بحث لا رہی ہے، یہی وہ رویے ہیں جو اس کو آفاقیت کے درجے پر پہنچا دیتے ہیں۔

شاعری اور تاریخ کے موضوعات کے حوالے سے بات کرتے ہوئے ارسطو اپنی کتاب بوطیقا میں لکھتے ہیں'' تاریخ اُس چیز کو بیان کرتی ہے جو ہو چکی ہے جب کہ شاعری اس قسم کی چیزوں کو سامنے لاتی ہے جو ہو سکتی ہیں اس وجہ سے شاعری بمقابلہ تاریخ زیادہ فلسفیانہ اور زیادہ توجہ کے قابل ہے شاعری آفاقی صداقتوں سے سروکار رکھتی ہے جب کہ تاریخ مخصوص واقعات سے سروکار رکھتی ہے''۔دوسرے لفظوں میں شاعری تاریخ کے جبر سے آزاد ہوتی ہے اس میں بیک وقت تینوں زمانوں کا بیان پایا جاتا ہے اور اس کے اندر 'روح عصر' موجود ہوتی ہے۔روح عصر درحقیقت ایک وسیع اصطلاح کا نام ہے البتہ اپنے محدود معنوں میں کسی عہد کی ناگزیر فکری سچائی یا ایسی سرگرمی جو اپنے زمانے کے سماجی، ثقافتی، مذہبی، سائنسی، معاشی، معاشرتی، سیاسی، داخلی اور خارجی حالات وضروریات کو کسی خاص نتیجے کے ساتھ ایک فکری اکائی کے طور پر بیان کرنے کا نام روح عصر ہے۔

کوئی شاعر یا ادیب اپنے عہد کے سماجی، سیاسی، علمی و ادبی تغیرات اور تحریکات سے بے نیاز و بے پرواہ نہیں رہ سکتا۔اس کے برخلاف وہ ان تغیرات، تحریکات وانقلابات کا نہ صرف گہرائی سے جائزہ لیتا ہے بلکہ ان کے نتیجے میں سماجی زندگی اور انسانی اقدار پر مرتب ہونے والے اثرات کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنے مخصوص نقطہ نظر کو شعر و ادب کے ذریعے پیش کرتا ہے۔اک باکمال شاعر و ادیب کی یہ نشانی ہوتی ہے کہ اس کے تخلیق کردہ شعر و ادب میں اس کا مکمل عہد سانس لیتا ہوا نظر آتا ہے۔

خورشید رضوی کا شمار بھی اُردو ادب کے اُن چند عظیم شعراء میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنے مخصوص شعری رویے اور نقطہ نظر سے نہ صرف اپنے معاصرین کو متاثر کیا بلکہ جدید اُردو غزل کے ادبی منظر نامے پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔راقم الحروف کے نزدیک خورشید رضوی کی شاعری ان کے عصری شعور کی مکمل طور پر

ترجمانی کرتی ہوئی نظر آتی ہے ان کی غزلیں عصری حسیت کے لبادے میں لپٹی ہوئی نظر آتی ہیں ۔خورشید رضوی نے غزل کی ہیئت کے ظاہری تجربات کرنے کے بجائے اس کے فکری موضوعات کو وسعت بخشی ہے ۔ان کی غزل میں معاشرتی نا ہمواریوں ، طبقاتی کشمکش ، سماجی رویوں اور دم توڑتی ہوئی انسانی اقدار کا نوحہ موجود ہے۔خورشید رضوی نے عہدِ حاضر کے مسائل کو نہ صرف عمیق نگاہی سے دیکھا ہے بلکہ انتہائی کرب کی کیفیت کے ساتھ انہیں اپنی غزلوں میں پیش بھی کیا ہے۔خورشید رضوی کی غزل کو عصری حسیت کے تناظر میں دیکھنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ وہ سماج کی بگڑتی ہوئی صورتحال میں اصلاح کی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے ۔ وہ بار بار اپنے قاری کو اپنے اسلاف کے ساتھ تعلق بحال کرنے کی سعی میں مگن نظر آتے ہیں شاید اسی بنا پر ان کی غزل میں بہت سے مقامات پر رجعت پسندی کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔

خورشید رضوی نے اپنی غزلوں میں عصری موضوعات کو اس احسن انداز میں بیان کیا ہے کہ وہ کسی بھی خاص عصر کے ساتھ مخصوص نہیں ہوتے بلکہ ان کی غزل ہر عہد کے فرد کی ترجمانی کرتی ہوئی نظر آتی ہے ۔خورشید رضوی کی غزل عربی و فارسی ادب کے زیر اثر ہے جس کی اثر ان کی غزلوں پر جا بجا نظر آتا ہے وہ الفاظ کو منفرد طریقے سے برتنے ، نت نئی تراکیب کا استعمال اور تلازمات کو احسن طریقے سے اپنی غزلوں میں سموتے ہیں جس کی بنا پر وہ اپنے معاصرین میں نمایاں مقام پر نظر آتے ہیں ۔

راقم الحروف نے مقالہ ہذا میں عصری حسیت کو مختلف فلاسفہ، علمائے مذاہب ،قرآن مجید و دیگر مقدس کتابوں ، ادبی دانشوران کے نقطہ نظر کی مدد کے ساتھ قلمبند کیا ہے اور حسیت کے دائرہ کار کا تعین کر کے سماج اور اس کے اندر موجود شعوری کارفرمائی کو 'سیاسی و سماجی شعور' کے عنوان سے مفصل طور پر پیش کیا ہے اور یہ بات باور کروائی ہے کہ سماج ایک اکائی ہے جس سے فرد بحیثیتِ اجتماع کے جُڑا رہتا ہے ۔ وہ اپنی فکر و عمل سے سماج پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس سے نتائج اخذ کرتا ہے پھر تاریخی و تہذیبی شعور کو اپنا موضوع بحث بناتے ہوئے تاریخ و تہذیب کے باہمی ربط کو بیان کیا ہے ۔ کیوں کہ جب تک ماضی سے آگاہی نہیں ہوگی ہم اپنا حال بہتر انداز میں نہیں گزار سکتے اور مستقبل کے لیے کوئی بہتر حکمت عملی طے نہیں کر سکتے ۔تہذیب سے ربط ہی دراصل ہمیں شعوری تکمیل تک رسائی حاصل کرنے میں مدد فراہم کرتا ہے ۔اس تمام بحث کو پیش نظر رکھتے ہوئے راقم الحروف نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ روحِ عصر ایک ایسی اجتماعی فکر ہے جس کے اثرات زمانوں کو اپنے حصار میں لے لیتے ہیں دراصل روحِ عصر وہ فکری دائرہ ہے جو تخلیق کار اور قاری میں انفرادیت کی لکیر تو کھینچتا ہے لیکن قاری کو تخلیق کار کا تابع بنا کر حقیقت تک پہنچاتا ہے بعدازاں مجموعی طور پر اُردو غزل میں عصری حسیت کا احاط

پیش کیا گیا ہے جس میں یہ بات ملحوظِ خاطر رکھی گئی ہے کہ ان شعرا کا انتخاب کیا جائے جن کے ہاں جمالیاتی تقاضوں کی ترجمانی رنگِ تغزل کی پاسداری کرتے ہوئے کی گئی ہے اور جن کے ہاں قلبی واردات کا بیان ہونے کے ساتھ ساتھ ذہنی امور کی وضاحت ، اخلاقی ، تہذیبی و سماجی زندگی کے بیش بہا عنوانات کے درمیان ایک مخصوص حدِ فاصل کو قائم رکھا گیا ہے ۔ مذکورہ بالا تمام اجزاء ایک لطیف فاصلے پر موجود ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے ساتھ مخلوط نہیں ہونے پاتے ۔

خورشید رضوی کی غزل کو سیاسی و سماجی شعور کے تناظر میں پرکھنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ خورشید رضوی سیاسی صورتحال سے پیدا ہونے والی خوبیوں اور نقائص کو واضح انداز میں بیان کرتے ہیں وہ سیاست کو معاشرے کی فلاح کے لیے ناگزیر تصور کرتے ہیں اور خورشید رضوی کی غزل میں سماجی شعور کے حوالے راقم الحروف کی یہ آرا ہیں کہ خورشید ضوی نے اپنی غزل کی تخلیق کے خام مال اپنے اردگرد کے ماحول یعنی اپنے سماج ہی سے اکٹھا کیا ہے یوں ان کا اپنے سماج سے رشتہ بہت مضبوط دکھائی دیتا ہے ان کی غزل سماج میں فعالیت کو اُجاگر کرتی ہے ۔

خورشید رضوی کی غزل میں سماجی دائرہ کا محور انسان ہے وہ انسان کی عظمت و رفعت کو سماج کی فتح گردانتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ وہ سماج میں موجود طبقاتی کھینچا تانی کا بیان بھی واضح انداز میں پیش کرتے ہیں وہ پرولتاری طبقے کے بنیادی حقوق کے استیصال ل کی آواز گرجدار انداز میں بلند کرتے ہیں کلمہ حق کہنا ان کا بنیادی وصف ہے ۔

خورشید رضوی کی غزل میں تاریخی و تہذیبی شعور کی جھلک بھی نمایاں طور پر نظر آتی ہے وہ مجموعی طور پر تاریخ سے منسلک ہو کر اپنے موجودہ زمانے میں تبدیلی کا عمل چاہتے ہیں وہ ماضی سے ہر حال میں سیکھنے کے خواہاں ہیں کسی طور بھی اسے فراموش نہیں کرتے ان کی غزلوں میں متوازن انداز میں تاریخی واقعات کا بیان موجود ہے ۔ خورشید رضوی کی غزل بتاتی ہے کہ وہ اپنی تہذیب سے محبت کرنے والے اور اقدار کو زندہ رکھنے والے شاعر ہیں ان کی غزل میں تہذیبی انحطاط کا ذکر مایوسی کے انداز میں نہیں ملتا بلکہ اس سے سیکھنے کی امید کی کو اجاگر کرتے ہوئے تذکرہ کیا گیا ہے وہ رجائیت کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتے اور اسلاف کی تہذیبی اقدار کو زندہ رکھنے کے خواہاں ہیں ۔

خورشید رضوی کی غزل میں موضوعات کا تنوع ملتا ہے جن میں مذہبی موضوعات کا رنگ نمایاں طور پر ملتا ہے شاید اس کی بڑی وجہ ان کا تعلق ایک علمی و ادبی خاندان سے ہونا ہے اور وہ خود بھی عربی علم و ادب سے وابستہ

رہے ہیں

ان موضوعات میں حیات و موت ، قضاء و قدر ، جبر و اختیار ، جنت و جہنم وغیرہ کو انہوں نے اپنے مخصوص اور منفرد انداز میں بیان کیا ہے وہ مسلمہ عقائد پر یقین رکھتے ہیں ان کے ہاں تصوف کی چاشنی بھی موجود ہے اور دقیق سے دقیق مسائل کو نہایت سلاست کے ساتھ پیش کرنے میں خاصل ملکہ رکھتے ہیں ہے۔

خورشید کی غزل میں ہمیں دنیا و آخرت کا بیان بھی واضح انداز میں ملتا ہے وہ دنیاوی چکا چوند میں اپنی ذات کو اس درجہ مدغم نہیں کرتے کہ خیال آخرت ذہن و دل سے محو ہو جائے بلکہ وہ اپنے قاری کو اس بات کی تلقین کرتے ہیں کہ دنیاوی ذمہ داریوں کو اس انداز سے سرانجام دو کہ اس جہان میں آنے کا حقیقی مقصد کو پس پشت نہ ہونے پائے۔خورشید رضوی کی غزل میں عشق روایتی معاملات سے قدرے مختلف ہے وہ عشق کو مکمل آگہی کا نام قرار دیتے ہیں۔

ان کے ہاں تذکرہ انسان مکمل سماجی حوالوں کے ساتھ موجود ہے وہ انسان کو کسی سپُر مین کے انتظار میں رہنے کا درس نہیں دیتے بلکہ خود اپنے آپ کو اس قابل کرنے کا درس دیتے ہیں کہ انسان معاشرے میں موجود دوسرے لوگوں کے کام آسکے۔

خورشید رضوی کی غزل میں تصورِ زندگی کو بھی واضح انداز میں بیان ہوا وہ زندگی کے کسی ایک پہلو کی تکرار کے قائل نہیں بلکہ توازن کے قائل ہیں وہ جہاں زندگی میں مسرت کو اہمیت دیتے ہیں وہاں غم پر بھی روشنی ڈالتے ہیں وہ مسرت کے لمحات کو بھی مثبت سوچ کے ساتھ گزارنے کے قائل ہیں اور غم کو برداشت کر کے خوشی کو برموقع محل منانے کے قائل ہیں۔

مختصر یہ کہ خورشید رضوی کی غزلوں میں سماج اپنے تمام تر حقائق کے ساتھ جلوہ گر ہے وہ عام آدمی کی زندگی میں آنے والے مسائل کو مکمل انداز میں بیان کرتے ہیں لیکن ان کا اندازِ بیان مایوس کن نہیں ہوتا بلکہ ان کا ڈھارس بندھانے کا انداز بھی منفرد ہے وہ مسائلِ زیست کو اس دنیا میں رہنے کی شرط سے تعبیر کرتے ہیں۔

آخر میں اس بات کو واضح کرتا چلوں کہ دورانِ تحقیق راقم الحروف نے اس بات کی حتی الامکان کوشش کی ہے کہ مقالہ تحقیقی معیار پر پورا اُترے اور اس میں کسی قسم کا سقُم موجود نہ رہے۔لیکن اگر پھر بھی اہلیانِ فکر و دانش کے نزدیک کوئی غلطی موجود ہو تو اسے خطائے انسانی سمجھ درگزر فرمائیں۔

کتابیات

بنیادی ماخذ

۱۔ خورشید رضوی، " یکجا "(کلیات)، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، اشاعت دوم ۲۰۱۲ء

۲۔ خورشید رضوی، " دیریاب "، القاء پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء

۳۔ خورشید رضوی، ڈاکٹر، "تالیف" (مضامین)، شہ تاج مطبوعات، لاہور، ۱۹۹۵ء

ثانوی ماخذ

۱۔ احتشام علی، " جدید اُردو نظم میں عصری حسیت "، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء

۲۔ احمد بن علی بن حجر العسقلانی، "فتح الباری شرح صحیح البخاری"، ۱۹۸۶ء

۳۔ اجراء (سہ ماہی) اپریل تا جون، کراچی، ۲۰۱۱ء

۴۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، " کشاف تنقیدی اصطلاحات"، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء

۵۔ افضال حسین، قاضی، "میرؔ کی شعری لسانیات"، نشاط پریس، یو۔ پی، ۱۹۸۳ء

۶۔ انور جمال، پروفیسر، " ادبی اصطلاحات"، نیلاب پرنٹرز، راولپنڈی، ۲۰۱۵ء

۷۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، " ایلیٹ کے مضامین"، ایجوکیشنل ہاؤس دلی، ۱۹۷۴ء

۸۔ خورشید انور، "قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں تاریخی شعور"، انجمن ترقی اُردو ہند ۱۹۹۳ء

۹۔ خورشید رضوی، ڈاکٹر، "تالیف (مضامین)"، شہ تاج مطبوعات، لاہور، ۱۹۹۵ء

۱۰۔ رشید امجد، ڈاکٹر، سلیم اختر، ڈاکٹر، (مرتبین)، " پاکستانی ادب میں حصہ نثر"، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء

۱۱۔ رشید امجد، ڈاکٹر، "میرا جی شخصیت اور فن"، نقش گر پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۰۶ء

۱۲۔ زاہد منیر عامر، ڈاکٹر، "ارمغانِ خورشید"، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۵ء

۱۳۔ سبطِ حسن، ' پاکستان میں تہذیب کا ارتقا"، مکتبہ دانیال، کراچی، بار ہشتم، ۱۹۸۹ء

۱۴۔ سبطِ حسن، 'ماضی کے مزار"، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۰۷ء

۱۵۔ سبطِ حسن، 'موسیٰ سے مارکس تک"، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۰۲ء

۱۶۔ سلام سندیلوی، "ماحول اور مزاج"، سفینہ ادب، لاہور، س۔ن

۱۷۔ سُنبل نگار، ڈاکٹر، "اُردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ"، شہزاد پرنٹرز، لاہور، س۔ن

۱۸۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، "نقدِ میرؔ"، آئینہ ادب لاہور، س۔ن

۱۹۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، "وجہی سے عبد الحق تک"، مکتبہ خیابان ادب، لاہور، طبع دوم ۱۹۷۷ء

۲۰۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، "اشاراتِ تنقید"، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۳ء

۲۱۔ سید وقار عظیم، پروفیسر، "اقبالیات کا مطالعہ"، (مرتب کردہ) ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، اقبال اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۵ء

۲۲۔ سید وقار عظیم (مرتب کردہ)، "اقبال معاصرین کی نظر میں"، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۳ء

۲۳۔ شمیم حنفی، "غالب کی تخلیقی حسیت"، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۰۵ء

۲۴۔ شان الحق حقی، "آئینہ افکارِ غالبؔ (کلامِ غالبؔ پر روشنی)"، ادارہ یادگارِ غالب، ۲۰۰۱ء

۲۵۔ شوکت سبزواری، ڈاکٹر، "غالب فکر و فن"، کُل پاکستان انجمن ترقی اُردو، کراچی، ۱۹۶۱ء

۲۶۔ شمس الرحمان فاروقی، "اندازِ گفتگو کیا ہے؟"، مکتبہ جامعہ، نئی دلی، ۱۹۹۳ء

۲۷۔ علی محمد خان، ڈاکٹر، "لاہور کا دبستانِ شاعری"، نشریات، لاہور، ۲۰۰۸ء

۲۸۔ عابد علی عابد، "اصول انتقادِ ادبیات"، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء

۲۹۔ عابد علی عابد، "اسلوب"، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء

۳۰۔ عاصمہ وقار (مرتب کردہ)، "مجموعہ تنقیدات"، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء

۳۱۔ علی عباس جلالپوری، "روحِ عصر"، تخلیقات، لاہور، ۲۰۱۱ء

۳۲۔ عبدالحمید، حکیم (انتخاب کردہ)، "مطالعاتِ کلامِ غالبؔ"، غالب اکیڈمی، نئی دلی، ۲۰۱۰ء

۳۳۔ عتیق احمد، فیضؔ، "عہد اور شاعری"، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۱ء

۳۴۔ غفور شاہ قاسم، "پاکستانی ادب شناخت کی نصف صدی"، ریز پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۰۰ء

۳۵۔ فیض احمد فیض، ''متاعِ لوح و قلم''، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۷۳ء

۳۶۔ فہیم اعظمی، ڈاکٹر، '' آراء''، مکتبہ سریر، کراچی، ۱۹۹۲ء

۳۷۔ قیصر الاسلام، قاضی، '' فلسفے کی جدید نظریات''، اقبال اکادمی، لاہور ۱۹۹۸ء

۳۸۔ کلیم الدین احمد، '' اُردو شاعری پر ایک نظر''، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، س۔ن

۳۹۔ گوپی چند نارنگ (مرتب کردہ)، '' ولی دکنی تصوف، انسانیت اور محبت کا شاعر''، ساہتیہ اکادمی، ۲۰۰۵ء

۴۰۔ گیان چند جین، ڈاکٹر، '' تحقیق کا فن''، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۴ء

۴۱۔ محمد حسین، طباطبائی، ''نهاية الحكمة''، بوستانِ کتاب، قُم، س۔ن

۴۲۔ منظر اعظمی، ڈاکٹر، '' اُردو ادب کے ارتقاء میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ''، اُتر پردیش اکادمی، لکھنو، ۱۹۹۶ء

۴۳۔ مبارک علی، ڈاکٹر، '' تاریخ فہمی''، تاریخ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء

۴۴۔ مبارک علی، ڈاکٹر، '' تاریخ اور تحقیق''، فکشن ہاؤس، لاہور، دوسرا ایڈیشن، ۲۰۰۵ء

۴۵۔ مبارک علی، ڈاکٹر، ''جاگیر داری''، مشعل بکس، لاہور، س۔ن

۴۶۔ مبارک علی، ڈاکٹر، '' غلامی اور نسل پرستی''، فکشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۸ء

۴۷۔ محمد ہادی حسین، '' شاعری اور تخیل''، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۵ء

۴۸۔ نظیر صدیقی، '' جدید اُردو غزل ایک مطالعہ''، گلوب پبلیشرز، لاہور، ۱۹۸۴ء

۴۹۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، '' تصوراتِ عشق و خرد اقبال کی نظر میں''، اقبال اکادمی، لاہور، طبع چہارم، ۲۰۰۰ء

۵۰۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، '' اُردو شاعری کا مزاج''، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۹ء

لغات

۱۔ سید احمد دہلوی، '' فرہنگِ آصفیہ''، اُردو سائنس بورڈ، لاہور ۲۰۰۶ء

۲۔ شان الحق حقی، '' فرہنگِ تلفظ''، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۰ء

رسائل و جرائد

۱۔ ''اجراء (سہ ماہی)''، کراچی، ۲۰۱۲ء

۲۔ ''برگِ گل (مجلہ)''، سرسید نمبر، اُردو کالج، کراچی، ۱۹۵۵ء

۳۔ ''پریاتا بیتا، عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو''، ادبیات، اسلام آباد، شمارہ ۸۳، ۸۴، ۲۰۰۹ء

۴۔ ''ماہِ نو''، لاہور، ۱۹۸۷ء

۵۔ ''فانوس (ماہنامہ)''، لاہور، ۲۰۱۷ء

International Islamic University Islamabad